

حقوق الزوہین

ہر سوسائٹی کے تمدن کی شیرازہ بندی کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا جامع قانون جو اس کے مخصوص طرز تمدن کے مزاج کی رعایت ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہو۔ دوسرے ایک ایسی ہیئت حاکمہ جو اس قانون کو ٹھیک ٹھیک اسی اسپرٹ میں نافذ کرنے والی ہو جس میں وہ وضع کیا گیا تھا۔ بد قسمتی سے ہندوستان کے مسلمان اس وقت ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں۔ بلاشبہ ان کے پاس کتابوں میں لکھا ہوا ایک قانون ضرور موجود ہے جو اسلامی تمدن و تہذیب کے مزاج سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہے اور تمدن و معاشرت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، مگر یہ قانون اب عملاً منسوخ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا قانون ان کے تمدنی معاملات پر فرماں برداری کر رہا ہے جو تمدن و معاشرت کے اکثر و بیشتر معاملات میں کلیتہً غیر اسلامی ہے، اور بعض معاملات میں اگر اسلامی ہے بھی تو ادا و صورتاً مسلمانانہ اس وقت جس ہیئت حاکمہ کے تابع ہیں اس نے عملاً ان کی تمدنی زندگی کو دو شعبوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ ایک شعبہ وہ ہے جس میں اس نے ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر بھی ایسے قوانین نافذ کر دیئے ہیں جو اسلامی تمدن کے مزاج سے کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتے۔ دوسرا شعبہ وہ ہے جس میں اس نے اصولاً مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جائے، مگر عملاً اس شعبہ میں بھی شرع اسلامی کا نفاذ صحیح طریق پر نہیں کیا جاتا۔ محض ان کے نام سے جس قانون کو اس

شعبہ میں نافذ کیا گیا ہے وہ اپنی شکل اور روح دونوں میں اصل اسلامی شریعت سے بہت کچھ مختلف ہے اور اس کے نفاذ کو صحیح معنوں میں شرع اسلامی کا نفاذ نہیں کہا جاسکتا۔

اس افسوس ناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم نقصان یہ ہے کہ اس نے ہمارے کم از کم ۱۵ فی صدی گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے، اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصے کی زندگیاں تلخ بلکہ تباہ و برباد کر دی ہیں۔ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کا سنگ بنیاد ہے، اور کوئی فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس قانون کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا جو اس تعلق کو منضبط کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔ کیونکہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک عمر کے ہر حصے میں یہ قانون کسی کبھی حیثیت سے انسان کی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر وہ بچہ ہے تو ماں اور باپ کے تعلقات اس کی تربیت میں موثر ہوں گے۔ اگر جوان ہے تو خود اس کو ایک شریک زندگی سے واسطہ پڑے گا۔ اگر سیدہ ہے تو اس کی اولاد ازدواجی تعلقات کی بندشوں میں بندھے گی اور اس کے قلب و روح کا سکون اور اس کی زندگی کا چین بڑی حد تک ان تعلقات کی بہتری پر منحصر ہو گا۔ غرض قانون ازدواج ایک ایسا قانون ہے جو قوانین تمدن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاتما ہے۔ اسلام میں اس قانون کی حقیقی اہمیت کو ملحوظ رکھ کر اس کی تدوین نہایت صحیح اصولوں پر کی گئی تھی، اور مسلمانوں کو ازدواجی معاملات میں اپنے دین سے ایک ایسا صالح، جامع اور مکمل قانون ملا تھا جس کو دنیا کے قوانین ازدواج میں ہر حیثیت سے بہترین کہا جاسکتا ہے۔ مگر شومی قسمت سے یہ قانون بھی ”محمدن لا“ کی جھپٹ میں آ گیا اور اس بری طرح مسخ ہوا کہ اس میں اور اصل اسلامی قانون ازدواج میں ایک بہت ہی دور کی مشابہت باقی رہ گئی ہے۔ اب شرع اسلامی کے نام سے مسلمانوں کے ازدواجی معاملات میں جو قانون نافذ ہے وہ نہ صالح ہے، نہ جامع، نہ مکمل۔ اس کے نقائص نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی پر اتنا بڑا اثر ڈالا ہے کہ شاید کسی دوسرے قانون نے نہیں ڈالا۔ مشکل ہی سے ہندوستان میں کوئی ایسا خوش قسمت خاندان مل سکے گا

جس میں اس ناقص قانون کی بدولت کوئی زندگی تباہ نہ ہوئی ہو۔ زندگیوں کا تباہ ہونا تو پھر بھی ایک امر حقیر ہے۔ اس سے زیادہ بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس قانون کی خرابی نے بکثرت مسلمانوں کی عزت و ناموس کو تباہ کیا، ان کے اخلاق اور ایمان کو برباد کر ڈالا، اور جو گھرانے کے دین اور ان کی تہذیب کے محفوظ ترین قلعے تھے ان میں بھی فوٹاش اور ارتداد کے سیلاب کو پہنچا دیا۔

قانون اور اس کو نافذ کرنے والی مشین کے نقائص سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان پر مزید خرابیوں کا اضافہ دو وجوہ سے ہوا۔ ایک دینی تعلیم و تربیت کا فقدان، جس کی بدولت مسلمان اسلام کے قانون ازدواج سے اس حد تک بیگانہ ہو گئے کہ آج اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمی اس قانون کے معمولی مسائل تک سے ناواقف ہیں۔ تفصیلات تو درکنار اس کے اصول تک کو جانتے اور سمجھنے والے مسلمان بہت کم ملیں گئے، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو عدالت کی کرسیوں پر بیٹھ کر ان کے معاملات نکاح و طلاق کا تصفیہ کرتے ہیں اسلامی قانون ازدواج کے مبادی تک سے ناواقف ہیں۔ اس عام جہالت نے مسلمانوں کو اس قابل بھی نہ رکھا کہ وہ بطور خود اپنے ازدواجی تعلقات میں اسلامی قانون کا ٹھیک ٹھیک اتباع کر سکیں۔ رہی دوسری وجہ تو وہ غیر اسلامی تمدنوں کا اثر ہے جس کی بدولت مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات میں نہ صرف بہت سے ایسے رسمیات اور وہمیات داخل ہو گئے ہیں جو اسلامی قانون ازدواج کے اصول اور اس کی اسپرٹ کے خلاف ہیں، بلکہ سرے سے زوجیت کا اسلامی تصور ہی ان کی ایک بڑی اکثریت کے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ کہیں منہڈ تصور غالب آ گیا ہے اور اس کا اثر یہ ہے کہ بیوی کو لونڈی اور شوہر کو آقا بلکہ دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ نکاح کی بندش اعتقاداً نہیں تو عملاً ناقابلِ نسخ ہے۔ طلاق اور خلع اس قدر معیوب ہو گئے ہیں کہ جہاں ان کی ضرورت ہے وہاں بھی ان سے محض اس بنا پر احتراز کیا جاتا ہے کہ کہیں ناک نہ کٹ جائے، خواہ درپردہ وہ سب کچھ کیا جائے جو درحقیقت طلاق اور خلع سے زیادہ بدتر ہے۔ طلاق کو روکنے کے لئے نہر کی مقدار اس قدر بڑھا دی گئی ہے کہ شوہر کبھی طلاق دینے کی جرأت نہ کر سکے، اور صافرت کی صورت میں عورت کو معلق رکھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔

”شوہر پرستی“ عورت کے مفاخر اور اخلاقی ذرائع میں داخل ہوگئی ہے سخت سے سخت حالات میں بھی ذہ معض ہو سکتی کی لعنت و ملامت کے خوف سے طلاق یا خلع کا نام زبان پر نہیں لاسکتی حتیٰ کہ اگر شوہر مر جائے تب بھی اس کا اخلاقی خرض یہ ہو گیا ہے کہ ہندو عورتوں کی طرح اس کے نام پر بیٹھی ہے۔ کیونکہ بیوہ کا نکاح ثانی ہونا نہ صرف اُس کے لئے بلکہ اس کے سارے خاندان کے لئے موجب ذلت ہے۔ دوسری طرف جو عورتیں فرنگی تہذیب سے متاثر ہوئی ہیں ان کا حال یہ ہے کہ وہ لَوْ نَظُنُّ مِثْلَ الَّذِي عَلَيَّهَا بِالْمَعْرُوفِ تُوْبْرُے زور سے کہتے ہیں مگر لِلرِّجَالِ عَلَيَّهَا دَرَجَةٌ پرنہیج کر دفعۃً ان کی آواز دب جاتی ہے اور جب الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَيَّ الْيَسَاءِ کا فقرہ ان کے سامنے آتا ہے تو ان کا بس نہیں چلتا کہ اس طرح اس آیت کو قرآن سے خارج کر دیں عجیب عجیب طریقہ سے اس کی تاویل کرتے ہیں، اور تاویل کا انداز کہے دیتا ہے کہ وہ اپنے دل میں اس بات پر سخت شرمندہ ہیں کہ ان کے مذہب کی مقدس کتاب میں یہ آیت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فرنگی تہذیب نے عورت اور مرد کی مساوات کا جو تصور پھونکا ہے اس سے وہ دہشت زدہ ہو گئے ہیں اور ان کے دماغوں میں ان ٹھوس اور مستحکم عقلی اصولوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے جن پر اسلام نے اپنے نظام معاشرت کو قائم کیا ہے۔

ان مختلف اسباب نے مل جل کر مسلمانوں کی حیات عائلی کو اتنا ہی بدتر کر دیا ہے جتنی وہ کسی زمانہ میں بہتر تھی۔ جہالت اور اجنبی تمدنوں کے اثر سے ان کے ازدواجی معاملات میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو سلجھانے سے موجودہ قانون اور اس قانون کو نافذ کرنے والی مشین سراسر قاصر ہے، بلکہ اس کے تصور نے ان پیچیدگیوں پر بہت سی مزید الجھنوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ نادانیت کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت یہ سمجھتی ہے کہ ان تمام خرابیوں کی وجہ اسلامی قانون کا نقص ہے۔ اسی لئے ایک قانون کی تدوین پر زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام میں ایک ایسا مکمل ازدواجی قانون موجود ہے جس میں نوجوانوں کے لئے انصاف کے ساتھ واضح حقوق متعین کیے گئے ہیں، ان حقوق کی حفاظت اور تعمیری

کی صورت میں (خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے) دادِ رسی کا پورا انتظام کیا گیا ہے، اور کوئی ایسی پیچیدگی نہیں چھوڑی گئی ہے جس کو عدل کے ساتھ حل نہ کر دیا گیا ہو۔ لہذا مسلمانوں کو کسی نئے قانون کی ضرورت ہی نہیں۔ اصلی ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون ازدواج اپنی صحیح صورت میں پیش کیا جائے اور اس کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام کوئی بہت آسان کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے علماء کا فرض ہے کہ تقلیدِ جامد کو چھوڑ کر موجودہ زمانے کے حالات و ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام کے قانون ازدواج کو ایسی صورت میں پیش کریں کہ مسلمانوں کے ازدواجی مسائل کی موجودہ پیچیدگیوں کو پوری طرح حل کیا جاسکے۔ اس کے بعد عام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے نظامِ معاشرت کو ان جاہلانہ رسموں اور ان جاہلی تصورات سے پاک کر دیں جن کو انہوں نے غیر اسلامی تمدنوں سے اخذ کیا ہے، اور اسلامی قانون کے اصول اور اسپرٹ کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنے معاملات انجام دیں پھر ایک ایسا نظام عدالت درکار ہے جو خود اس قانون پر ایمان رکھتا ہو اور جس کے منصفوں کو علمی اور اخلاقی حیثیت سے وہ ترمیم دی گئی ہو جو اس قانون کی تنقید کے لئے مطلوب ہے تاکہ وہ اسے کسی غیر اسلامی قانون کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ اس کی اپنی اسپرٹ میں نافذ کریں۔

یہ مضمون اسی ضرورت کو مد نظر رکھ کر لکھا جا رہا ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں اسلامی قانون ازدواج کا ایک پورا خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں اس قانون کے مقاصد، اصول اور احکام سب چیزیں اپنے اپنے موقع پر بیان کی جائیں گی۔ حسب ضرورت ہم تشریح کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے فیصلوں کی نظیریں اور ائمہ سلف کی اجتہادی آراء بھی نقل کریں گے تاکہ ان سے جزئی مسائل مستنبط کرنے میں آسانی ہو۔ آخر میں چند ایسی تجویزیں پیش کی جائیں گی جن سے اصول شرع اسلامی کے مطابق مسلمانوں کے ازدواجی معاملات کی موجودہ الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔

قانون ازدواج کے مقاصد

قانون کی تفصیلات سے پہلے مقاصد قانون کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ قانون میں سب سے اہم چیز اس کا مقصد ہے۔ مقصد ہی کو پورا کرنے کے لئے اصول مقرر کئے جاتے ہیں، اور ان اصولوں کے ماتحت احکام دئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مقصد کو سمجھے بغیر احکام نافذ کرے گا تو بہت ممکن ہے کہ کسی جزوی مسئلہ میں وہ ایسا حکم نافذ کر دے جس سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص قانون کے مقصد سے واقف نہ ہو گا وہ قانون کی صحیح اسپرٹ کے مطابق اس کا اتباع بھی نہ کر سکے گا۔ لہذا ہم پہلے ان مقاصد کی تشریح کریں گے جن کے لئے اسلام میں ازدواجی معاملات کے لئے قانون مقرر کیا گیا۔

اخلاق و عفت کی حیانت | اسلامی قانون ازدواج کا پہلا مقصد اخلاق کی حفاظت ہے۔ وہ زنا کو حرام قرار دیتا ہے اور نوع انسانی کی دونوں صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطہ کا پابند بنادیں جو اخلاق کو فحش اور بے حیائی سے اور تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اسی لئے قرآن مجید میں نکاح کو لفظ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حصن قلعہ کو کہتے ہیں، اور احسان کے معنی قلعہ بند بنانے کے ہیں۔ جو مرد نکاح کرتا ہے وہ ”حصن“ ہے۔ گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس سے نکاح کیا جاتا ہے وہ حصن ہے۔ یعنی وہ اس قلعہ کی حفاظت میں آگئی ہے جو نکاح کی صورت میں اس کے نفس و اس کے اخلاق کی حفاظت کیلئے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ استعارہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں نکاح کا اولین مقصد اخلاق اور عصمت کا تحفظ ہے اور قانون ازدواج کا پہلا کام اس قلعہ کو مستحکم کرنا ہے جو نکاح کی صورت میں اس گراں قدر چیز کی حفاظت کیلئے تعمیر کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ:

أَجَلٌ لَّكُمْ مَا دَرَبُوا فِيكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ
مُحْصِنِينَ غَيْرِ مُسَافِحِينَ (النساء-۴)

جو عورتیں تم پر حرام کی گئی ہیں ان کے سوا باقی سب عورتیں
تم پر حلال کر دی گئیں بشرطیکہ شہوت رانی کے لئے نہیں

بلکہ قید نکاح میں لانے کے لئے تم اپنے اموال کے بدلے میں ان کو حاصل کرنا چاہو۔

پھر عورتوں کے لئے کہتا ہے :-

فَاِنَّكُمْ مَرْهُونٌ بِاٰيٰتِنَا اٰهْلِيْنَ وَ اَتُوْهُنَّ اَجْرَهُنَّ
بِالْمَعْرُوْثِ مَخْصُوْبٍ غَيْرِ مُسَافِحٍ وَّلَا
مُتَّخِذَاتِ اٰخِذَانَ (النساء-۴)

پس تم ان کے مردھروں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح
کرنا اور مٹا سبب طور پر ان کے مردا کرنا تاکہ
وہ محصنات بنیں نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے بگاری کر نیوالیاں

دوسری جگہ ارشاد ہے :-

اَلْيَوْمَ اَحَلُّ لَكُمْ اَطْيَبُ..... وَالْمَحْصَنَاتِ
الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتِ مِنَ
الدِّينِ اِذْ تُوَلَّا لِكُتُبِ
قَبْلِكُمْ اِذَا اَتَيْتُمُوهُنَّ اَجْرَهُنَّ
مُحْصِنِيْنَ غَيْرِ مُسَافِحِيْنَ وَّلَا
مُتَّخِذِيْ اٰخِذَانَ (المائدہ-۱)

آج تمہارے لئے تمام پاک چیزیں حلال کی گئیں۔۔۔ اور
باعث عورتیں خواہ وہ مومن ہوں یا اہل کتاب میں
بشرطیکہ تم ان کے مردا کر کے قید نکاح میں لانے والے
ہو نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے ناجائز تعلقات پیدا کرنے والے

ان آیات کے الفاظ اور معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز

کی ہے کہ مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق میں احسان، یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو۔ یہ لیا
مقصد ہے جس کے لئے ہر چیز کو قربان کیا جاسکتا ہے مگر کسی دوسری چیز کے لئے اس کو قربان
نہیں کیا جاسکتا۔ زوجین کو نکاح کی قید میں اسی لئے مقید کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر
کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر اپنی فطرت کے داعیات کو پورا کریں۔ لیکن اگر کسی قید نکاح میں
ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن سے حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو تو بجائے اس کے کہ نکاح کی ظاہری قید
کو برقرار رکھنے کے لئے اللہ کی حدود کو قربان کیا جائے، بدرجہا بہتر یہ ہے کہ اللہ کی حدود پر ایسی قید نکاح
کو قربان کر دیا جائے۔ اسی لئے ایلاہ کرنے والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ چار مہینہ سے زیادہ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں،
اور اگر وہ چار مہینے کی مدت گزرنے پر بھی رجوع نہ کریں تو انہیں ایسی عورت کو قید نکاح میں رکھنے کا کوئی
حق نہیں ہے جس سے وہ ہم بستر نہیں ہونا چاہتے، کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت اپنے داعیات

فطرت کو پورا کرنے کے لئے حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہوگی، جس کو اللہ کا قانون کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو لوگ ایک سے زیادہ بیویاں کرتے ہیں ان کو سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ **ذَلَّا لَيَمِينُوا** **كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ** یعنی ایک عورت کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری عورت گویا معلق رہ جائے۔ اس حکم کا مقصد بھی یہی ہے کہ عورت کو ایسی حالت میں مبتلا نہ کیا جائے جس سے وہ حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو یا ایسی حالت میں نکاح کی ظاہری قید برقرار رہنے سے بہتر ہے کہ اس کو توڑ دیا جائے اور عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لئے آزاد ہو جائے۔ پھر عورت کو خلع کا حق بھی اسی مقصد کے تحت دیا گیا ہے۔ ایک عورت کا کسی ایسے شخص کے پاس رہنا جس سے وہ خوش دم ہو یا جس سے اس کے نفس کو اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو، اس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دینا ہے جن میں حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہے۔ اس لئے ایسی عورت کو حق دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کو اس کا مال (جوہر کی صورت میں اسے ملا تھا) یا اس سے کم زیادہ لے کر قید نکاح سے رہائی حاصل کر لے۔

قانون اسلامی کی ان دفعات کو آگے چل کر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔ مگر یہاں ان مثالوں کے بیان کرنے سے اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی قانون نے اخلاق و عفت کی حفاظت کو سب چیزوں سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور اگرچہ وہ قید نکاح کو حتی الامکان ہر طریقہ سے مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جہاں اس قید کے برقرار رہنے سے اخلاق و عفت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہاں وہ اس متاع گراں مایہ کی خاطر نکاح کی گرہ کو کھول دینا ضروری سمجھتا ہے۔

اسلامی قانون کی جو دفعات آئندہ بیان کی جائیں گی ان کو سمجھنے اور ان کو قانون کی حقیقی اسپرٹ کے مطابق نافذ کرنے کے لئے اس نکتہ کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

مودت و رحمت اور دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان ازدواج کا تعلق مودت و رحمت کی بنیاد پر ہو، تاکہ مناکحت سے تمدن و تہذیب کے جو مقاصد منعلق ہیں ان کو وہ

اپنے اشتراک عمل سے بدرجہ اتم پورا کر سکیں، اور ان کو اپنی خانگی زندگی میں وہ راحت و مسرت اور سکون کا اہم حاصل ہو سکے جس کا حصول انہیں تمدن کے بالاتر مقاصد پورے کرنے کی قوت بہم پہنچانے کے لئے ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اس مقصد کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں زوجیت کا نکتہ ہی مردت و رحمت ہے، اور زوجین بنائے ہی اس لئے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:-

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً - (الروم-۳)

اور دوسری جگہ فرمایا ہے:-

وہی ہے جس نے تم کو تن واحد سے پیدا کیا اور اس کے لئے خود اسی کی جنس سے ایک جوڑا بنایا تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ بَيْنَهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا (اعراف-۲۲)

پھر ایک دوسرے پیرا میں زوجیت کے اس تصور کو یوں پیش کیا ہے:-

وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔

هُوَ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ (بقرہ-۲۳)

یہاں زوجین کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے۔ لباس وہ چیز ہے جو انسان کے جسم سے متصل رہتی ہے۔

اس کی ستر پوشی کرتی ہے، اور اس کو خارجی فضا کے مضر اثرات سے بچاتی ہے۔ اس لباس کے استعارہ کو زوجین کے لئے استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے درمیان مناکحت کا تعلق معنوی حیثیت سے ویسا ہی تعلق ہونا چاہیے جیسا کہ جسم اور لباس کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے دل اور ان کی روہیں ایک دوسرے کے

ساتھ متصل ہوں، وہ ایک دوسرے کی ستر پوشی کریں، اور ایک دوسرے کو ان اثرات سے بچائیں جو ان کی عزت اور ان کے اخلاق پر حرج لانے والے ہوں یہی مقتضی ہے مودت و رحمت کا اور اسلامی نقطہ نظر سے یہ ازدواجی تعلق کی اصلی روح ہے۔ اگر کسی ازدواجی تعلق میں بیحد نہیں ہے تو گویا وہ ایک لاشہ بے جان ہے۔ اسلام میں ازدواجی تعلقات کے لئے جو قوانین مقرر کئے گئے ہیں ان سب میں اس مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ زوجین اگر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں تو صلح و آشتی، محبت اور دلی یکجہتی کے ساتھ ہیں، ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں، اور آپس کے تعلقات میں فیاضانہ برتاؤ رکھیں۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو پھر ان کی یکجہتی سے جلائی بہتر ہے، کیونکہ مودت و رحمت کی روح نکلنے کے بعد ازدواجی تعلق ایک مردہ جسم ہے جس کو اگر دفن نہ کر دیا جائے تو عفونت پیدا ہوگی اور اس سے خانگی زندگی کی ساری نفاذ ہر آلود ہو جائے گی۔ اسی لئے قرآن مجید کہتا ہے کہ:-

وَاِنْ تَصِلُوْهُمُ وَتَقُوْا اِيَّانَ اللّٰهِ كَانَ عَفُوًّا
رَحِيْمًا وَاِنْ يَتَفَرَّقَا فَاِغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ
سَعْيِهِمْ۔ (النساء- ۱۹)

اگر آپس میں موافقت سے رہو اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے بچو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر یہ تمہارے لئے اور (زوجین ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ اپنے وسیع خزانہ غیب سے ہر ایک کی کفالت کرنے والا ہے۔

پھر جبکہ جگہ احکام بیان کرنے کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ

یا تو بھلے طریقہ سے ان کو اپنے پاس رکھا جائے یا احسان
نیک برتاؤ کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْبٍ اَوْ تَسْرِيْمٌ بِالْحَسَانِ
(نقرہ- ۲۹)

یا تو بھلے طریقہ سے ان کو اپنے پاس رکھو یا بھلے طریقہ سے
ان سے جدا ہو جاؤ۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْبٍ اَوْ قَارُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْبٍ۔ (الطلاق- ۱)

اپنی بیویوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔

وَعَايِشُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْبِ (النساء- ۳)

یا تو بھلے مانسوں کی طرح اُن کو رکھو یا بھلے مانسوں کی طرح
 رخصت کرو بیٹھ سنا کے لئے ان کو نہ روک رکھو ان کی
 حق تلفی کرنے لگو اور جو ایسا کرے گا نہ اپنے تنس پر خود
 ظلم کرے گا یعنی اپنے آپ کو خدا کے عذاب مستحق بنائے گا،
 اور آپس کے تعلقات میں فضل کو نہ بھولو یعنی نیامنی
 کا برتاؤ کرو۔ (۲۹)

تَأْمِسُكُمْ هُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سِرِّحُوهُنَّ
 بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا
 وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (بقرة-۲۹)
 وَلَا تَنسُوا لِفَضْلِ يَدْنِكُمْ (بقرة-۳۱)

طلاق رجعی کے احکام جہاں بیان کئے گئے ہیں وہاں رجوع کے لئے نیک نیتی کی شرط لگا دی گئی ہے
 یعنی دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق سے پہلے شوہر کو حق ہے کہ اپنی بیوی کی طرف رجوع کرے، مگر شرط
 یہ ہے کہ اس کی نیت صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کی ہو نہ کہ ستانے اور لٹکانے رکھنے کی و بَعْدُ لَتُمْسِكُنَّ أَحَقُّ
 بِرَدِّهِنَّ مِنِّي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا (بقرة-۲۸)

پھر ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جو اپنے مذہب اپنے خیالات اور تمدن و
 معاشرت میں مسلمانوں سے اتنی مختلف ہیں کہ مسلمان ولی محبت اور قلب و روح کی یک جہتی کے ساتھ ان سے
 میل نہیں کھا سکتے، کیونکہ ایسی صورت میں ازدواج کا رشتہ کوئی صحیح تمدنی رشتہ نہ ہوگا بلکہ محض ایک
 شہوانی رشتہ بن جائے گا، اور اس میں یا تو مودت و رحمت نہ ہوگی، یا اگر ہوگی تو وہ اسلامی تہذیب و تمدن
 کے لئے مفید ہونے کے بجائے مضر ہو جائے گی۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا وَكَأَمَّةٌ
 مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَكَأَنْتُمْ كَمَا كُنْتُمْ وَلَا
 تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا وَاعْبُدُوا مَعَكُمْ
 خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَكَأَنْتُمْ كَمَا كُنْتُمْ (بقرة-۲۷)

مشک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ
 لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرک سے بہتر ہے
 اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔ اور مشرک مردوں سے اپنی عورتوں
 کی شادیاں نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔

اہل کتاب کے معاملہ میں اگرچہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ ان کی عورتوں سے نکاح کر لیا جائے کیونکہ تہذیب کے مبادی میں ایک حد تک ہمارے اور ان کے درمیان اشتراک ہے لیکن اس کو بھی اسلام میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ کعب بن مالک نے ایک کتابیہ سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرمایا، اور مانعت کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ اِنَّهَا لَنْ تُحْصِنَكَ، وہ تجھے محسن نہیں بنا سکتی، کیونکہ اس صورت میں دونوں درمیان مودت و رحمت نہ ہوگی جو احسان کی اصلی روح ہے۔ حضرت حذیفہ نے ایک یہودی سے نکاح کرنا چاہا تو حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ اُسے چھوڑ دو حضرت علیؓ اور حضرت ابن عمرؓ نے کتابیت سے نکاح کو بصرحت مکروہ فرمایا ہے اور حضرت علیؓ نے کراہیت کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ یعنی جو مومن ہے وہ ایسے لوگوں سے محبت نہیں کر سکتا جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہوں، اور جب زوجین میں محبت ہی نہ ہو تو ایسا نکاح کس کام کا۔

عرض مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ صیانت اخلاق و عفت کے بعد دوسری تیز جو اسلام کے قانون ازدواج میں مقصدی اہمیت رکھتی ہے وہ زوجین کے درمیان مودت و رحمت ہے۔ جب تک ان کے تعلقات میں اس چیز کے باقی رہنے کی امید ہو، اسلامی قانون ان کے رشتہ مناکحت کی حفاظت پر اپنی پوری قوت صرف کرتا ہے، اور جب یہ مودت و رحمت باقی نہ ہے، اور اس کی جگہ بے دلی، سرد مہری، نفرت، اور بیزاری پیدا ہو جائے، تو قانون کا میلان، رشتہ نکاح کی گرہ کھول دینے کی طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی اس قابل ہے کہ اس کو ذہن نشین کر لیا جائے، کیونکہ جو لوگ اس کو نظر انداز کر کے قانون اسلامی کے اصول کو جزئیات پر منطبق کرتے ہیں وہ قدم قدم پر ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں جن سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

اصول قانون

قانون کے مفاد سمجھ لینے کے بعد ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اسلامی قانون ازدواج کی تدوین کن اصولوں پر کی گئی ہے، اس لئے کہ جب تک اصول ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہوں، جزئی مسائل میں قانون کے احکام کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنا مشکل ہے۔

اصل اول | اصل قانون میں پہلی اصل جس پر بہت سے احکام مستفرد ہوتے ہیں، یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں مرد کو عورت سے ایک درجہ زائد دیا گیا ہے: **وَلِلرِّجَالِ عَلَيُّهُنَّ دَرَجَةٌ** اس درجہ کی تشریح ہم کو اس آیت میں ملتی ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْعَمُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ وَالصِّلَاتُ قُنُوتٌ حَفِظْتُ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ (النساء-4)

مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی اور ان کی غیر موجودگی

میں بتوفیق الہی ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والی ہیں۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ مرد کو عورت پر فضیلت کس بنا پر ہے اور اس کو قوام کیوں بنایا گیا ہے؟ یہ قانون کی نہیں فلسفہ اجتماع کی بحث اپنے موضوع کے دائرے میں رہ کر ہم یہاں صرف اس امر کی صراحت کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ خانگی زندگی کے نظم کو برقرار رکھنے کے لئے بہر حال زوجین میں سے ایک کا قوام اور صاحب امر ہونا ضروری ہے۔ اگر دونوں بالکل مساوی درجہ اور مساوی اختیارات رکھنے

دلے ہوں تو بد نظمی کا پیدا ہونا یقینی ہے، جیسی کہ فی الواقع ان قوموں میں رونما ہو رہی ہے جنہوں نے عملاً زوجین کے درمیان مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام چونکہ ایک نظری مذہب ہے اس لئے اس نے انسانی فطرت کا لحاظ کر کے زوجین میں سے ایک کو توأم اور صاحب امر اور دوسرے کو مطیع اور ماتحت بنانا ضروری سمجھا، اور توأمیت کے لئے اُس فریضے کا انتخاب کیا جو فطرۃً یہی درجہ لے کر پیدا ہوا ہے۔

مرد کے فرائض پس اسلامی قانون کے ماتحت ازدواجی زندگی کا جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے، اس میں مرد کی حیثیت توأم کی ہے، اور اس حیثیت میں اس پر حسب ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔

۱۔ مہر ادہ عورت کا مہر ادا کرے، کیونکہ اس کو عورت پر جو حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں وہ اسی مہر کا معاوضہ ہیں۔ اور جو آیت نقل کی گئی ہے اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگرچہ اصل فطرت کے لحاظ سے مرد ہی توأمیت کا مستحق ہے، مگر بالفعل یہ مرتبہ اس کو اُس مال کے معاوضہ میں ملتا ہے جو وہ مہر کی صورت میں خرچ کرتا ہے اس کی تشریح دوسری آیات میں بھی کی گئی ہے۔ مثلاً۔

اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کر دو۔
محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تمہارے لئے حلال
کی گئیں کہ اپنے اموال کے بدلے تم ان کو نکاح میں
لاؤ۔۔۔۔۔ پس ان سے تم نے جو تمتع کیا ہے اس کے
بدلے میں قرار داد کے مطابق تم ان کے مہر ادا کر دو
پس لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت پر نکاح
کر دو اور مناسب طور پر ان کے مہر ادا کر دو۔
اور حلال کی گئیں تمہارے لئے عورتیں جو مہنوں

وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتٍ مِّمَّا فَخَلَتْ (النساء-۱)
وَدَخِلْ لَكُمْ مَاؤُمرَاءُ ذَٰلِكُمْ أَنْ يَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ
..... فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ
أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (النساء-۴)

فَأَنْكِحُوهُنَّ بِأَدْنِ أَهْلِيهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ
بِالْمَعْرُوفِ. (النساء-۴)
وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ

مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ
إِذَا تَلَّمَعْتُمْ أَجْوَدَهُنَّ (المائدہ-۱)

میں سے اور عورت دلدل عورتیں ان لوگوں میں سے
جن کے پاس تم سے پہلے کتاب بھیجی جا چکی ہے جب کہ
تم ان کے بہرا داد کرو۔

پس نکاح کے وقت عورت اور مرد کے درمیان مہر کی جو قرارداد ہوئی ہو اس کو پورا کرنا مرد پر لازم
ہے۔ اور اگر وہ اس قرارداد کو پورا کرنے سے انکار کرے تو عورت کو حق ہے کہ اپنے نفس کو اس سے
روک لے۔ یہ ایسی ذمہ داری ہے جس سے سبکدوش ہونے کی کوئی صورت مرد کے لئے بجز اس کے نہیں
ہے کہ عورت یا تو اس کو بہت دے یا اس کی ناداری کا لحاظ کر کے بخوشی معاف کرے، یا اس پر احسان
کر کے برضا و رغبت اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔

فَإِنْ طَبِقَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ
هَيْئًا مَرِيئًا۔ (النساء-۱)

پھر اگر وہ خوش دلی کے ساتھ مہر میں سے کچھ معاف
کر دیں تو اس کو مرے سے کھاؤ پیو۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا تَرَا ضَيْتُمْ بِهِ
مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ (النساء-۲)

اور اگر تم قرارداد کے بعد اس میں کم زیادہ پر یا بھی
رضامندی سے کوئی تصفیہ کر لو تو اس میں کچھ معافی نہیں

۲۔ نفق شوہر کا دوسرا فرض نفعہ ہے۔ قانون اسلام نے زوجین کے حدود و عمل کی واضح طور پر تسمیح کر دی ہے۔
عورت کا کام گھر میں بیٹھنا اور خانگی زندگی کے فرائض انجام دینا ہے۔ رَدِّ قَرْنٍ فِي بَيْتِكَ لِمَا وَمَرَد
کا کام کمانا اور اپنے اہل کے لئے ضروریات زندگی فراہم کرنا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے جس کی بنا پر شوہر
کو اپنی بیوی پر نفیضیت کا ایک درجہ دیا گیا ہے۔ اور یہ چیز تو امیت کے عین مفہوم میں داخل ہے۔ تو ام کہتے
ہی اس شخص کو ہیں جو کسی شے کی نگہبانی اور خبر گیری کرنے والا ہو، اور اسی حیثیت سے اس شے پر اقتدار

لے اسی کو ہر شے کہتے ہیں۔ مگر آج کل بہر شے کا مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ وقت پر ہزاروں لاکھوں کی دستاویز بیکھ کر رکھ دی جاتی ہے
کہ کون لیتا ہے کون دیتا ہے؟ گویا ابتدائی سماج کی نیت نہیں ہوتی، حالانکہ اس نیت کے ساتھ جو نکاح کیا جائے وہ عطا شدہ فائدہ

رکھتا ہو۔ قرآن مجید کی آیت **الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ** الخ میں **وَلِيًّا** لُفُقُوا مِنْ أُمُوَائِهِمْ سے جس طرح بہر کا وجوب ثابت ہوتا ہے اسی طرح نفقہ کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے مگر شوہر اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو قانون اس کو ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔ اور بصورت انکار یا بصورت عدم استطاعت اس کا نکاح فسخ کر دے گا۔ لیکن نفقہ کی مقدار کا تعین عورت کی خواہشات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ مرد کی استطاعت پر ہے۔ قرآن مجید نے اس بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے کہ **عَلَى الْمُؤْتَمِرِ قَدْرُهُ وَعَلَى الْمُقْتَرِدِ قَدْرُهُ**۔ مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور مفلس پر اس کی استطاعت کے مطابق نہیں کہ عزیز آدمی سے وہ نفقہ وصول کیا جائے جو اس کی حیثیت سے زیادہ ہو یا مالدار آدمی وہ نفقہ دے جو اس کی حیثیت سے کم ہو۔

۴۔ ظلم سے اجتناب مرد کا تیسرا فرض یہ ہے کہ اس کو عورت پر جو توجیحی حقوق اور اختیارات دیئے گئے ہیں ان کو ظالمانہ طریقہ سے استعمال نہ کرے۔ ظلم کی متعدد صورتیں ہیں، مثلاً:-

ایلا عورت کے دعوایات نفس کو پورا کرنے کے کسی عذر جائزہ کے بغیر اعراض کرنا، جس کا مقصد محض اس کو سزا دینا اور تکلیف پہنچانا ہو۔ اس کے لئے قانون اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار ہیئیں کی مدت دکھی ہے۔ اس مدت کے اندر مرد پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے تعلق زن و شو قائم کرے، ورنہ انقضائے مدت کے بعد اس کو مجبور کیا جائے گا کہ عورت کو چھوڑے۔

لَّذِيْنَ يُؤْتُونَ مِنَ نِّسَاءِهِمْ تَرْبُصُ الْبَعَّةِ
 اَشْهُرٍ فَإِنْ نَأَوْوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ
 وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ

جو لوگ اپنی عورتوں سے ایلا کرتے ہیں ان کے لئے
 چار ہیئیں کی نہلت ہے۔ اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے
 والا بہر بان ہے اور اگر طلاق کا عزم کر لیں تو اللہ سننے

لے عذر جائزہ سے مراد مرد یا عورت کی بیماری یا مرد کا حالت سفر میں ہونا، یا کوئی اور ایسی صورت پیش آجانے ہے جس میں مرد اپنی بیوی کی طرف رغبت رکھتا ہو مگر اس کے پاس جانے پر قادر نہ ہو۔

عَلَيْمَةً - (بقرہ- ۲۸)

اور جاننے والا ہے۔

اس مسئلہ میں بعض فقہاء نے حلف کی شرط لگائی ہے یعنی اگر مرد نے اپنی عورت کے پاس نہ جاننے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلاز ہوگا اور یہ حکم جاری کیا جائے گا، لیکن اگر قسم نہیں کھائی ہے تو خواہ وہ دس برس بھی اس سے علیحدہ ہے اس پر ایلاز کا اطلاق نہ ہوگا۔ لیکن یہ بات قانون اسلامی کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔ کسی شخص کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاسکتی۔ اس قاعدہ کلیہ کے ماتحت قرآن مجید میں عورت کی فطری قوت برداشت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر سزا کے طور پر عورت کو صحبت سے محروم کیا جائے تو یہ سزا صرف اتنی مدت کے لئے ہونی چاہئے جس کو وہ برداشت کر سکتی ہے۔ اس مدت سے زیادہ سزا دینے میں تکلیف مالا یطاق ہے، اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے جس سے مرد و عورت کو محفوظ رکھنا اسلامی قانون کا اولین مقصد ہے۔ پس آیت مذکورہ الصدر کا اصل مدعا محض یہ ہے کہ عورت کو ترک صحبت کی تکلیف چار مہینے سے زیادہ مدت کے لئے نہ دی جائے۔ رہا قسم کھانا یا نہ کھانا، تو یہ اس مسئلہ میں کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا۔ قسم نہ کھانے سے عورت کی تکلیف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اور قسم کھالینے سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام میں سے جو لوگ تفقہ فی الدین کا شرف رکھتے تھے (مثلاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر) ان کی رائے اس باب میں یہی تھی کہ خیار کی نیت سے عورت کو چھوڑ دینا ایلاز ہے، خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو (احکام القرآن للجصاص المحنفی ج ۱۔ ص ۲۰)۔

فان عزموا الطلاق کی تفسیر میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان، زید بن ثابت، ابن مسعود، اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے کہ چار مہینے کی مدت کا گذر جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، لہذا اس مدت کے ختم ہونے پر اس کو رجوع کا حق باقی

نہیں رہتا۔ حضرت علی و ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے مگر ایک دوسرا قول جو مورخ الذکر دونوں بزرگوں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہنچا ہے، یہ ہے کہ ختم مدت پر شوہر کو نوٹس دیا جائے گا کہ یا اپنی بیوی سے رجوع کر دیا اس کو طلاق سے دو۔ لیکن جب ہم آیت کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو یہاں تو یہاں ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے تُو لٰی کو بالفاظ صریح صرف چار مہینہ کی مہلت دی ہے۔ اس کو رجوع کا حق اس مہلت کے اندر ہے، اور اس کے ختم ہو جانے پر دوسری صورت بجز عزیمت طلاق کے اور کوئی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص چار مہینہ کے بعد اس کو رجوع کا حق دیتا ہے تو گویا وہ اس کی مہلت میں اضافہ کرتا ہے جو کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے صریح تجاوز ہے۔

ضرار اور تعدی | عورت سے رغبت نہ ہو، اس کو رکھنا نہ چاہے، مگر محض ستانے اور زیادتی کرنے کے لئے اس کو رکھ چھوڑے، بار بار طلاق دے اور دو طلاقیں کے بعد تیسرے طلاق سے پہلے رجوع کر لے۔ قرآن مجید میں اس کو نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

وَلَا تُسْكِرُ هُنَّ حَيْرَانَ لْتَتَدَّ دَاوَمًا
 وَيَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَكَلَّمَ أَخَاهُ
 اور ان کو ستانے اور زیادتی کرنے کے لئے نہ روک رکھو،
 جو ایسا کرے گا وہ اپنے اُپر آپ ظلم کرے گا۔ اللہ کی
 آیت اللہ ہمزوا (البقرہ-۲۹)

ضرار اور تعدی کے الفاظ نہایت وسیع ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ستانے اور زیادتی کرنے کی نیت سے کسی عورت کو روک رکھے گا وہ ہر طرح سے اس کو آزار پہنچائے گا، روحانی اور جسمانی تکلیفیں دے گا، ادنیٰ طبقہ کا ہو گا تو مار پیٹ اور گالم گلوچ کر لے گا، اونچے طبقے کا ہو گا تو تدلیس اور ایذا رسانی کے دوسرے طریقے اختیار کرے گا۔ ضرار اور تعدی کے الفاظ ان سب پر حاوی ہیں، اور قرآن مجید کی رو سے یہ سب افعال مبنوع ہیں۔ جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرتا ہے وہ اپنی جائزہ

حد سے تجاوز کا مرتکب ہوتا ہے اور ایسی صورت میں عورت اس کی مستحق ہے کہ قالون کی مدد لے کر اس مرد سے چھٹکارا حاصل کرے۔

ازواج میں عدل نہ کرنا متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں عدل نہ کرنا، اور کسی ایک کی طرف مائل ہو کر دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق رکھ چھوڑنا یہ بھی قرآن کی حد سے ممنوع ہے:

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمِيلِ فَتَنَ سُرُوهَا
كَيْسِي اَيَكِ كِي طَرَفِ بِاللَّيْلِ نَهَجَكَ پَرُو كِه دوسری کو
كَامُعَلَّقَةٍ - (النساء - ۱۹)
گو یا معلق رکھ چھوڑو۔

قرآن میں تعدد ازدواج کی اجازت عدل کی شرط سے مشروط ہے۔ اگر عدل نہ ہو تو اجازت آپ سے آپ منسوخ ہو جاتی ہے۔ اذافات الشرط فاعل المشروط۔ خود اس آیت میں جہاں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے، یہ صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَعْبُدُوا فَوَاحِدًا
أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَلِكَ أَدْنَى
أَلَّا تَعْبُدُوا (النساء - ۱)
پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک
ہی بیوی رکھو یا لونڈی جو تمہارے قبضہ میں ہو۔ یہ
زیادہ تر قرآن مصلحت ہے تاکہ تم حق سے
متجاوز نہ ہو جاؤ۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے أَلَّا تَعْبُدُوا کے معنی یہ کیے ہیں کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں جن کی پرورش کا بار تم پر پڑ جائے۔ لیکن یہ اصل لغت کے خلاف ہے۔ لغت میں حول کے معنی میں کے ہیں۔ البوطالب کا شعر ہے:-

بِمِيزَانِ صَدِيقٍ لَا يَخْسُ شَعْبِيرَةً
وَدَرَّانٍ تَسِطُّ وَنَرْنَهَ غَيْرِهَا مِثْلِ
یہاں مائل بمعنی مائل مستعمل ہوا ہے۔ اسی اصل سے حول کو جوڑا اور طریق عدل سے ہٹ
جلنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، چنانچہ ابن عباس، حسن، مجاہد، شعبی، عکرمہ اور قتادہ

وغیر ہم نے لاقولوا کے معنی لا تمیلوا عن الحق کیسے ہیں۔ لہذا قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دویا زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا، اور ایک کی طرف جھک کر دوسری کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے، وہ ظالم ہے، تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں۔ قانون ایسی حالت میں اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرے گا۔ اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دوسری پالنے کا حق ہوگا۔

عدل کے باب میں قرآن کریم نے تصریح کر دی ہے کہ دلی محبت کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس میں مساوات برتنے پر نہ انسان قادر ہے، اور نہ اس کے لئے مکلف ہے (وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ الْمَرْءِ وَالْمَرْءِ وَكُنْتُمْ اَعْمٰی) البتہ اس کو تکلیف جس بات کی دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نفقہ اور معاشرت اور تعلقات زن و شو میں ان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔

مرد کے نشوز کی یہ تین صورتیں ایسی ہیں جن میں قانون مداخلت کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ زوجین کے باہمی تعلقات میں بہت سے ایسے معاملات بھی پیش آسکتے ہیں اور آتے رہتے ہیں جو مودت و رحمت کے منافی ہیں مگر ان میں قانون کے لئے مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید نے ایسے معاملات کے لئے شوہروں کو عام اخلاقی ہدایات دی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کے ساتھ مرد کا برتاؤ فیاضانہ اور محبت آمیز ہونا چاہئے، رات دن کی تھکا فنیختی کے ساتھ زندگی گزارنا حماقت ہے، اگر عورت کو رکھنا ہے تو سیدھی طرح سے رکھو، نہ بنے تو سیدھی طرح رخصت کر دو۔ قرآن کی ان ہدایات کو قانون کی طاقت سے نافذ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ میاں بیوی کے ہر جھگڑے میں قانون مداخلت کیا کرے، لیکن اس سے قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ عدل و انصاف اور رحمت و مودت کے برتاؤ کی ذمہ داری زیادہ تر مرد پر عائد کرتا ہے۔

مرد کے حقوق | مرد کو تو اہمیت کا مرتبہ جن ذمہ داریوں کے ساتھ دیا گیا ہے وہ ادا پر بیان ہوئے اب بیکھنا

چلے ہے کہ تو ام ہونے کی حیثیت سے مرد کے حقوق کیا ہیں۔

حفظ اللغیب | عورت پر مرد کا پہلا حق قرآن مجید نے ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے جن کا بدل کسی دوسری

زبان میں مہیا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کہتا ہے:

فَالصِّلَاتُ حَافِظَاتُ لِلْغَيْبِ

جو نیک عورتیں ہیں وہ غیب کی حفاظت کرنے والی

بِمَا حَفِظَ اللَّهُمَّ - (النساء - ۶)

ہیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے ماتحت

یہاں حفظ اللغیب سے مراد ہر اس چیز کی حفاظت کرنا ہے جو شوہر کی ہو اور اس کی غیر موجودگی میں بطور امانت عورت کے پاس ہے، اس میں اس کے نسب کی حفاظت، اس کے نطفہ کی حفاظت اس کے مال کی حفاظت، اس کے رازوں کی حفاظت، غرض سب ہی کچھ آجاتا ہے۔ اگر عورت ان حقوق میں سے کسی حق کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو مرد کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

شوہر کی اطاعت | مرد کا دوسرا حق یہ ہے کہ عورت اس کی اطاعت کرے۔ فَاالصِّلَاتُ قَائِمَاتُ (النساء - ۶)

جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی ہیں۔ یہ ایک عام حکم ہے جس کی تشریح میں نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے متعدد چیزیں بیان فرمائی ہیں:- مثلاً

إِنَّ لَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَنْ لَا يُؤْطِنَنَّ قَرْبَكُمْ أَحَدًا اتَّكُرْهُنَّ -

تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے ان کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔

وَلَا تَصَدَّقَنَّ بِشَيْءٍ مِنْ بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ

وہ اس کے گھر میں سے کوئی چیز اس کی اجازت کے

فَإِنْ فَعَلَتْ كَأَن لَهَا الْآجُرُ وَعَلَيْهَا الْوِزْرُ

بغیر صدقہ نہ کرے۔ اگر ایسا کرے گی تو آجور شوہر کو

وَلَا تَخْرُجَنَّ مِنْ بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ -

لے گا اور گناہ عورت پر ہوگا۔ نیز وہ اس کی اجازت

کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلے۔

لا تصوم المرأة يوماً من وجهاً شاهد
من غير رمضان الا باذنہ۔
خیر النساء امراتہ اذا نظرت الیہا من تک
وإذا امرتہا طاعتک و إذا عبت عنہا
حفظتک فی مالک و نفسہا۔
عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں رمضان کے نفل
روزہ اس کی اجازت کے بغیر ایک دن بھی نہیں رکھ سکتی۔
بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کو دیکھے تو تیرا دل
خوش ہو جائے اور جب تو اس کو کوئی حکم دے تو وہ تیری
اطاعت کرے اور جب تو اس کے پاس موجود نہ ہو تو
وہ تیرے مال اور اپنے نفس میں تیرے حق کی حفاظت کرے۔

اس عام حکم اطاعت میں صرف ایک استثناء ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر عورت سے اس کا شوہر اللہ
کی معصیت کا مطالبہ کرے تو وہ اس حکم کو ماننے سے انکار کر سکتی ہے مثلاً وہ فرض نماز اور روزے
سے منع کرے، یا شراب پینے کا حکم دے، یا پردہ شرعی ترک کرے، یا فواحش کا ارتکاب اس سے کرنا چاہے،
تو عورت نہ صرف اس کی مجاز ہے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ شوہر کے ایسے حکم کو ٹھکرا دے، اس لئے کہ لا
طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ اس صورت خاص کے سوا باقی تمام صورتوں میں شوہر کی
اطاعت عورت کا فرض ہے۔ اگر نہ کرے تو ناشرہ ہوگی اور شوہر کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق
ہوگا جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

مرد کے اختیارات | قانون اسلام نے چونکہ مرد کو توأم بنایا ہے، اور اس پر عورت کے بہرہ نفع، اور نگہبانی و خبر گیری
کی ذمہ داری عائد کی ہے، اس لئے وہ مرد کو عورت پر چند ایسے اختیارات عطا کرتا ہے جو خانگی زندگی کا نظم
برقرار رکھنے، اور اپنے گھر کے اخلاق اور حسن معاشرت کی حفاظت کرنے، اور خود اپنے حقوق و اولاد سے
بچانے کے لئے اس کو حاصل ہونے ضروری ہیں۔ قانون اسلام میں ان اختیارات کو بوضوح بیان
کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ وہ حدود بھی متعین کر دی گئی ہیں جن کے اندر یہ اختیارات استعمال
کیے جاسکتے ہیں۔

نصیحت، آدیب اور تعزیر | اگر عورت اپنے شوہر کی اطاعت نہ کرے، یا اس کے حقوق میں سے کسی حق کو تلف کرے تو ایسی صورت میں مرد پر لازم ہے کہ پہلے اس کو نصیحت کرے، نہ ملنے تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے برتاؤ میں حسب ضرورت اس کے ساتھ سختی کرے، اور اگر اس پر بھی نہ ملے تو وہ اس کو مار سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی اطاعت کرنے لگے۔

وَالَّتِي يُخَافُونَ نُشُوزَ هُنَّ فَيَحْضُوهُنَّ
وَأَهْجُرُهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضِرٌ بُوهُنَّ
فَإِنْ أَطَعْتُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا۔
اور جن عورتوں سے تم نشوز دیکھو ان کو نصیحت کرو
اور بستروں پر ان کو چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ اگر وہ
تمہاری اطاعت کریں تو پھر ان پر سختی کرنے کا
کوئی طریقہ نہ ڈھونڈو۔ (النساء-۴)

اس آیت میں وَاهْجُرُهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (یعنی بستروں پر ان کو چھوڑ دو) سے سزا کے طور پر ترک مباشرت کی اجازت دی گئی ہے، مگر آیت ایسا کرنے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، اس کے لئے ایک فطری حد مقرر کر دی ہے۔ ہجر فی المضاجع کی حد چار مہینے کی ہے۔ جو عورت اتنی نافرمان اور نشوزیدہ سر ہو کہ شوہر ناراض ہو کر اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے، اور وہ جانتی ہو کہ چار مہینے تک یہ حالت قائم رہنے کے بعد شوہر ازدوائے احکام الہی اس کو طلاق سے دے گا اور پھر بھی وہ اپنے نشوز سے باز نہ آئے، وہ اسی قابل ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ چار مہینے کی مدت اس کو ادب سکھانے کے لئے کافی ہے۔ اس سے زیادہ مدت تک یہ سزا دینا غیر ضروری ہوگا، کیونکہ اتنے دن تک اس کا نشوز پر قائم رہنا یہ جانتے ہوئے کہ اس کا نتیجہ طلاق ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں ادب سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، یا وہ جن معاشرے کے ساتھ کم از کم اس شوہر سے نباہ نہیں سکتی۔ نیز اس سے وہ مقاصد بھی فوت ہونے کا اندیشہ ہے جن کے لئے ایک مرد کو ایک عورت کے ساتھ رشتہ مناکحت میں باندھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ.....

لہ نشوز کے معنی اتفاح کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد ادا لے حق سے اعراض ہے خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

ایسی حالت میں شوہر اپنی خواہشات نفس پوری کرنے کے لئے کسی ناجائز طریقہ کی طرف مائل ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا ہو جائے۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ جہاں احد الزوجین اس قدر ضدی اور شوریدہ سر ہو وہاں زوجین میں مودت و رحمت قائم نہ ہو سکے گی۔

امام سفیان ثوری سے واہجروہن فی المصاحیح کے معنی میں ایک دوسرا قول منقول ہے۔ وہ کلام عرب سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ ہجر کے معنی باندھنے کے ہیں ہجر البعیر اذا ربطہ صاحبہ بالجناد۔ ہجرا اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی پیٹھ اور ٹانگوں کو ملا کر باندھی جاتی ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ جب وہ نصیحت نہ قبول کریں تو گھر میں ان کو باندھ کر ڈال دو۔ دوسری سزا جس کی اجازت زیادہ شدید حالات میں دی گئی ہے، مارنے کی سزا ہے مگر اس کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرب غیر مبرح کی قید لگا دی ہے یعنی ضرب شدید نہ ہونی چاہئے۔

اضربوہن اذا عصینکم فی المعروف
ضرباً غیر مبرح۔
اگر وہ تمہارے کسی جائز حکم کی نافرمانی کریں تو
ان کو ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ

ہو۔

ولا یضرب الوجه ولا یقیم۔
منہ پر نہ مارے اور گالم گلوچ نہ کرے۔

یہ دو سزائیں دینے کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، سزا اس نافرمانی پر دی جاسکتی ہے جو "معروف" میں ہو۔ یعنی ایسے احکام میں جو مرد کے جائز حقوق سے متعلق ہوں، نہ یہ کہ ہر جاوے جا حکم کی اطاعت پر اصرار کیا جائے اور عورت نہ مانے تو اس کو سزا دی جائے۔ پھر قصور اور سزا کے درمیان بھی تناسب ہو چاہئے۔ اسلامی قانون کے کلیات میں سے ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ تَبَّحْتُمْ عَلَیْكُمْ فَاَعْتَدُوا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَا عَلَیْكُمْ۔ جو کوئی

تم پر زیادتی کرے اس پر اتنی ہی زیادتی کر دیتی اس نے کی ہے زیادتی کی نسبت سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ جس قصور پر نصیحت کافی ہے اس پر ترک کلام، اور جس پر ترک کلام کافی ہے اس پر ہجرتی المنساجع، اور جس پر ہجرتی المنساجع کافی ہے اس پر بار تا ظلم میں شمار ہوگا۔ اور ایک آخری سزا ہے جو صحت شدید اور ناقابل برداشت قصور پر دی جاسکتی ہے۔ اور اس میں بھی وہ عدل ملحوظ رکھنی ضروری ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے۔ اس سے تجاوز کرنے کی صورت میں مرد کا نشوز ہوگا اور عورت کو حق ہو جائے گا کہ اس کے خلاف قانون سے استمداد کرے۔

طلاق | دوسرا اختیار مرد کو یہ دیا گیا ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ نباہ نہ کر سکتا ہو اس کو طلاق دے دے۔ چونکہ مرد اپنا مال خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے، اس لئے ان حقوق سے دست بردار ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے۔ عورت کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا تھا کیونکہ اگر وہ طلاق کی مختار ہوتی تو مرد کا حق ضائع کرنے پر دلیل ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ صرف کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا وہ اس کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا، اور صرف اُس وقت اسے چھوڑے گا جب اس کے لئے چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر مال صرف کرنے والا ایک ہو، اور ضائع کرنے کا اختیار دوسرے کو مل جائے تو اس دوسرے شخص سے یہ امید کم کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کے استعمال میں اس شخص کے مفاد کا لحاظ کرے گا جس نے مال صرف کیا ہے۔ پس مرد کو طلاق کا اختیار دینا نہ صرف اس کے جائز حق کی حفاظت ہے، بلکہ اس میں یہ بھی مصلحت مضمر ہے کہ طلاق کی کثرت نہ ہو۔

اصل دوم | اسلامی قانون ازدواج کی دوسری اہل یہ ہے کہ مناکحت کے تعلق کو اسکا کافی حد تک مستحکم بنایا جائے، اور جو مرد و زن ایک مرتبہ اس رشتہ میں بندھ چکے ہوں ان کو باہم جمع رکھنے کی انتہائی کوشش کی جائے، مگر حسب ان کے درمیان محبت اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ رہے

اور رشتہ مناکحت میں ان کے بندھے رہنے سے قانون کے اصل مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو نفرت و کراہیت اور طبائع کی ناموافقت کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھنے سے پہتر یہ ہے کہ ان کے لئے علیحدگی کا راستہ کھول دیا جائے۔ اس معاملہ میں اسلامی قانون نے فطرت انسانی کی رعایت اور تمدنی مصالح کی حفاظت کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا ہے جس کی مثال دنیا کے کسی قانون میں نہیں مل سکتی ایک طرف وہ رشتہ نکاح کو مستحکم بنانا چاہتا ہے مگر نہ اتنا مستحکم جتنا ہندو مذہب اور مسیحیت میں ہے کہ زوجین کے لئے مناکحت کی زندگی خواہ کتنی ہی شدید مصیبت بن جائے بہر حال وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہو سکیں۔ دوسری طرف وہ علیحدگی کے راستے کھولتا ہے مگر نہ اتنے آسان جتنے روس، امریکہ اور مغرب کے اکثر ممالک میں ہیں کہ ازدواجی تعلق میں سرے سے کوئی پابندی ہی باقی نہ رہے مادہ رشتہ ازدواج کی کمزوری سے عائلی زندگی کا سارا نظم و بہم برہم ہو جائے۔

اس اصل کے ماتحت علیحدگی کی جو صورتیں رکھی گئی ہیں وہ تین ہیں۔ طلاق، خلع، اور قضائے قاضی۔

طلاق اور اس کی شرائط اصطلاح شرع میں طلاق سے مراد وہ علیحدگی ہے جس کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے۔ مرد اپنے اس اختیار میں زاوہ ہے۔ وہ جب چاہے اپنے ان حقوق زوجیت سے دست بردار ہو سکتا ہے جن کو اس نے مہر کے معاوضہ میں حاصل کیا تھا مگر شریعت اسلامی طلاق کو پسند نہیں کرتی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابغض اللہ الی اللہ تعالیٰ الطلاق (اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے اور تو خود جو اولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات) (شادیاں کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مرے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا) اس لئے مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ایسی شرائط کا پابند کر دیا گیا ہے جن کے ماتحت وہ اس اختیار کو محض ایک آخری چارہ کار کے طور پر ہی استعمال کر سکتا ہے قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ اگر عورت تم کو ناپسند بھی ہو تو جہاں تک ہو سکے اس کے ساتھ بناہنے کی کوشش کرو۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ كَمَا كَرِهْتُمُوهُنَّ
ان کے ساتھ اچھے سلوک سے رہو۔ اگر وہ تم کو ناپسند

فَقَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ بَيْنَهُ
خَيْرًا كَثِيرًا (النساء-۳)

بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کر دو اور
اللہ اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے۔

لیکن اگر نباہ نہ کر سکتے ہو تو تم کو حق ہے کہ اس کو طلاق دے دو، مگر ایک لحنت چھوڑ دینا درست
نہیں ہے۔ ایک ایک مہینہ کے فاصلہ سے ایک ایک طلاق دو۔ تیسرے مہینے کے اختتام تک تم کو سوچنے
سمجھنے کا موقع حاصل ہے گا۔ ممکن ہے کہ اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے، یا عورت کے رویہ میں کوئی خوش
آیند تغیر ہو، یا خود تمہارا ہی دل بدل جائے۔ البتہ اگر اس مہلت میں سوچنے اور سمجھنے کے باوجود تمہارا فیصلہ
یہی ہو کہ اس عورت کو چھوڑ دینا چاہئے تو پھر تیسرے مہینے کے ختم پر آخری طلاق دے دو جو تم کو عورت سے
قطعی طور پر جدا کر دے گی۔

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَإِمْسَاكَ يَعْرِوْبُ أَ وَ
تَسْرِيْعٌ بِإِحْسَانٍ (بقرہ-۲۹)

طلاق دو مرتبہ ہے، پھر یا تو بھلے طریقے سے روک لیا
جائے یا پھر شرفیاً نہ طریقے سے چھوڑ دیا جائے۔

وَالْمُطَلَّاقُ يَتَرَتَّبُ نِصْنَ بِنَافْسِيْهِنَّ ثَلَاثَةَ
قُرُوْبٍ..... وَيُعُوْبَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرِدِّهِنَّ
فِي ذٰلِكَ اِنْ اَرَادَ اِصْلَاحًا (بقرہ-۲۸)

مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک انتظار میں
رکھیں..... اگر ان کے شوہر اصلاح کا ارادہ رکھتے
ہوں تو اس مدت میں وہ ان کو پھر لینے کے زیادہ حقدار ہو
گئے

اس کے ساتھ حکم یہ ہے کہ تین مہینوں کی اس مدت میں عورت کو اپنے گھر سے بھیج نہ دو بلکہ اپنے ساتھ رکھو ممکن
ہے کہ ساتھ رہنے بسنے سے دل مٹنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَ
أَحْضُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا
تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ
إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ

جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے
شروع میں طلاق دو اور عدت کا زمانہ گنتے رہو
اور اللہ سے ڈرو اور ان کو گھروں سے نکال نہ دو
اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس صورت کے کہ وہ کسی کھلی

حُدُّوْهُ اللهُ وَمَنْ يَتَّعِدْ حُدَّوْهُ اللهُ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللهُ يُخَدِّثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا فَإِذَا بَلَغَتِ بَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَوْقَارِتُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ (الطلاق-۱)

بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ تجھ کو کیا خبر کہ اللہ اس کے بعد کوئی اصلاح کی صورت پیدا کرے۔ پھر جب وہ مدت مقررہ کے اختتام کو پہنچے لگیں تو یا ان کو نیکی کے

ساتھ روک لو یا نہیں تو نیکی کے ساتھ عدائی اختیار کر لو (یعنی آخری طلاق دے دو جو بائن ہوگی)۔

پھر حالت حیض میں بھی طلاق دینے سے منع کیا گیا، اور حکم دیا گیا کہ طلاق دینا ہو تو طہر کی حالت میں دو، کیونکہ حیض کی حالت میں مرد اپنی بیوی سے رکا ہوا ہوتا ہے، اگر یہ رکاوٹ نہ ہے تو امید کی جاسکتی ہے کہ جذبات لطیف شاید اس کو بیوی کی طرف راغب کر دیں اور طلاق کا ارادہ بدل جائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی۔ حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ سن کر برہم ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دو کہ رجوع کرے اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تب طلاق دے۔ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمر کو اس نفل پر تو بیع فرمائی اور طلاق کے طریقے کی تیسیم اس طرح دی :-

”ابن عمر نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کرو پھر ایک ایک طہر پر ایک

ایک طلاق دو، پھر جب وہ (تیسری مرتبہ) طہر ہو تو اس وقت یا طلاق دے دو

یا اس کو روک لو۔“

حضرت ابن عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ! ادایت لو کنت طلقتهما ثلاثا ان كان لي ان ارجعها؟

”اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا مجھے رجوع کا حق باقی رہتا؟“ حضور نے فرمایا

لا، کانت یتین و تکون معصیة - نہیں وہ جدا ہو جاتی اور یہ گناہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینا گناہ ہے، شرع اسلامی کی اہم مصلحتوں کے خلاف ہے، اور اس سے اللہ کی مدد لڑتی ہیں جن کے احترام کا سورہ طلاق میں سخت تاکید حکم دیا گیا ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے والا اُن کے پاس آتا، وہ اس کو مارتے تھے اور اس کے بعد زوجین کو جدا کر دیتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا اِنَّهُ قَدْ عَصَى رَبَّهُ وَبَانَتِ امْرَاَتُهُ - اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی، اور اس کی عورت اس سے جدا ہو گئی حضرت علی فرماتے ہیں كَوَانِ النَّاسُ اَصَابُوا حَدَّ الطَّلَاقِ مَا نَدِمُوا حَتَّى امْرَاَتِهِ - اگر لوگ طلاق کی ٹھیک ٹھیک حدود کا لحاظ کرتے تو کسی شخص کو اپنی بیوی کے جدا ہونے پر نادم نہ ہونا پڑتا۔

طلاق میں اتنی رکاوٹیں ڈالنے کے بعد آخری اور سخت رکاوٹ یہ ڈالی گئی کہ جو شخص کسی عورت کو طلاق بائن دے چکا ہو وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا تا وقتیکہ وہ عورت ایک دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اور وہ دوسرا اس سے لطف اندوز ہو چکنے کے بعد برحناور عبت اُسے طلاق نہ دے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدِ حَتَّىٰ تَنْكِحَ
 زَوْجًا غَيْرًا (بقرہ-۲۹)

پھر اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت
 اس کے نئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ عورت
 ایک دوسرے سے نکاح نہ کرے۔

یہ ایسی کڑی شرط ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے سے پہلے سو مرتبہ سوچنے لگا اور اس وقت تک طلاق نہ دے گا جب تک وہ اس امر کا قطعی فیصلہ نہ کرے گا کہ اسے اس عورت کے ساتھ نباہ کرنا نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس شرط سے بچنے کے لئے یہ حیلہ نکالا ہے کہ جس عورت

کو طلاق دینے کے بعد کوئی شخص نادیم ہو اور اس سے پھر نکاح کرنا چاہے تو وہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کرائے اور پھر کچھ وقتے دلا کر اس کو خلوت سے پہلے طلاق دلوائے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف تصریح فرمادی ہے کہ تحلیل کے لئے نکاح تزدیج کافی نہیں بلکہ عورت اس وقت تک پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے لطف صحبت نہ حاصل کرے یا تحمل لزوجہا الاولیٰ حتیٰ ینذوق الاخر و عیلتھا و تذوق عیلتہ۔ پھر جو شخص اپنی مطلقہ عورت کو اپنے لئے حلال کرنے کی خاطر کسی سے اس کا نکاح کرائے، اور جو اس غرض سے نکاح کرے، ان دونوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُحَلَّلَ وَالْمَحَلَّلَ لَهُ۔ (ترمذی)

خلع

شرع اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ کسی طرح نباہ نہیں سکتا اسے طلاق دے دے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گزار بسر نہ کر سکتی ہو اس سے خلع حاصل کرے۔

اس باب میں احکام شریعت کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو اخلاقی ہے اور دوسرا قانونی۔ اخلاقی پہلو تو یہ ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کو طلاق یا خلع کا اختیار صرف ایک آخری چارہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہئے نہ یہ کہ محض خواہشات کی تسکین کے لئے طلاق اور خلع کو کھیل بنا لیا جائے۔ چنانچہ احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات منقول ہیں کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَائِقِينَ وَالذَّوَائِقَاتِ۔ الرَّائِدُ مَرَّةً يَكْفِي وَالرَّائِدَاتُ مَرَّةً يَكْفِي

والیوں کو پسند نہیں کرتا،

لعن الله كل ذواق مطلق (مطلب لذت بکثرت طلاق دینے والے پر اللہ نے لعنت

کی ہے)۔

ایما امرأة اختلعت من زوجها بغير نشوز فعليها لعنة الله والملائكة والناس اجمعين (جس کسی عورت نے اپنے شوہر سے نشوز کے بغیر خلع لیا اس پر اللہ اور ملائکہ اور لوگوں کی لعنت) المختلعات هن المناقات (خلع کو کھیل بنا لینے والی عورتیں منافق ہیں)

لیکن قانون جس کا کام اشخاص کے حقوق متعین کرنا ہے اس پہلو سے بحث نہیں کرتا۔ وہ جس طرح مرد کو شوہر ہونے کی حیثیت سے طلاق کا حق دیتا ہے اسی طرح عورت کو بھی بیوی ہونے کی حیثیت سے خلع کا

حق دیتا ہے تاکہ دونوں کے لئے بوقت ضرورت عقد نکاح سے آزادی حاصل کرنا ممکن ہو، اور کوئی فریق بھی ایسی حالت میں مبتلا نہ کر دیا جائے کہ دل میں نفرت ہے، مقاصد نکاح پورے نہیں ہوتے، رشتہ ازدواج ایک معیبت بن گیا ہے، مگر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ محض اس لئے بندھے ہوئے ہیں کہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ رہا یہ سوال کہ دونوں میں سے کوئی فریق اپنے حق کو بے جا طور پر استعمال کرے گا، تو اس بارے میں قانون جہاں تک ممکن اور معقول ہے، پابندیاں عائد کر دیتا ہے، مگر حق کو بجا یا بجا استعمال کرنے کا انحصار بڑی حد تک خود استعمال کرنے والے کے اختیار تیزی اور اس کی دیانت اور خدا ترسی پر ہے۔ اس کے اور خدا کے سوا کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ محض طالب لذت ہے یا فی الواقع اس حق کے استعمال کی جائز حاجت رکھتا ہے۔ قانون اس کا فطری حق اے دینے کے بعد اس کو بجا استعمال سے روکنے کے لئے صرف ضروری پابندیاں اس پر عائد کر سکتا ہے۔ چنانچہ طلاق کی بحث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مرد کو عورت سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق دینے کے ساتھ اس پر متعدد قیود لگا دی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ جو مہر اس نے عورت کو دیا تھا اس کا نقصان گوارا کرنے کا زمانہ حیض میں طلاق نہ دے، تین طہروں میں ایک ایک طلاق دے، عورت کو زمانہ عدت میں اپنے ساتھ رکھے، اور جب تین طلاقیں دے چکے تو پھر وہ عورت تھلیل کے بغیر دوبارہ اس کے نکاح میں نہ آسکے۔ اسی طرح عورت کو بھی خلع کا حق دینے کے ساتھ چند قیود عائد کر دی گئی ہیں جن کو قرآن مجید کی اس مختصر سی آیت میں تمام دکان بیان کر دیا گیا ہے۔

خلع کی شرط وَلَا يَجِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَانَا إِلَّا يَفِيمًا
حَدُّ وَدَّ اللَّهِ فَإِنْ يَخَفْتُمْ إِلَّا يَقْتُمَا حُدُّ
اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ (بقرہ ۲۹)

تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو کچھ تمہان کو دے چکے ہو وہ واپس لے لو، البتہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ اللہ کی حد و پر قائم نہ رہ سکیں گے، تو ایسی صورت میں جب کہ تم کو خوف ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حد و پر قائم نہ رہ سکیں گے

کچھ مضائقہ نہیں اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر عقد نکاح سے آزادی حاصل کر لے۔

اس آیت سے حسب ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں:-

۱۔ خلع ایسی حالت میں ہونا چاہئے جبکہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہو۔ فلا جناح علیہما کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ اگرچہ خلع ایک بری چیز ہے، جس طرح کہ طلاق بڑا ہے، لیکن جب یہ خوف ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو خلع لینے میں کوئی بُرائی نہیں۔

۲۔ جب عورت عقدہ نکاح سے آزاد ہونا چاہے تو وہ بھی اسی طرح مال کی قربانی گوارا کرے جس طرح مرد کو اپنی خواہش سے طلاق دینے کی صورت میں گوارا کرنی پڑتی ہے۔ مرد اگر خود طلاق دے تو وہ اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا جو اس نے عورت کو دیا تھا اور اگر عورت جدائی کی خواہش کرے تو وہ اس مال کا ایک حصہ یا پورا مال واپس کر کے جدا ہو سکتی ہے جو اس نے شوہر سے لیا تھا۔

۳۔ اقدار (یعنی معاوضہ دے کر رہائی حاصل کرنے) کے لئے محض فدیہ دینے والی کی خواہش کافی نہیں بلکہ اس معاملہ کا اتمام اس وقت ہوتا ہے جب کہ فدیہ لینے والا بھی راضی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ عورت محض ایک مقدار مال پیش کر کے آپ سے آپ علیحدہ نہیں ہو سکتی، بلکہ علیحدگی کے لئے ضروری ہے کہ جو مال وہ پیش کر رہی ہے، اس کو شوہر قبول کرے۔

۴۔ خلع کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ عورت اپنا پورا نہریا اس کا ایک حصہ پیش کر کے علیحدگی کا مطالبہ کرے اور مرد اس کو قبول کر کے طلاق دے دے۔ فلا جناح علیہما فیما افتدت بہ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ خلع کا اصل تر اضنی طرفین سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو خلع کے لئے فضلے قاضی کو شرط قرار دیتے ہیں۔

۵۔ اگر عورت فدیہ پیش کرے اور مرد قبول نہ کرے تو اس صورت میں ان کی طرف رجوع کیا جائے گا جو خِفْتُمْ کے مخاطب ہیں، یعنی مسلمانوں کے اولی الامر اور چونکہ اولی الامر کا اولین فرض حدود اللہ کی

حفاظت ہے، اس لئے ان پر لازم ہو گا کہ جب حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف متحقق ہو جائے تو عورت کو اس کا وہ حق دلوادیں جو انہی حدود کے تحفظ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا ہے۔

یہ عمل احکام میں جن میں اس امر کی تصریح نہیں کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف، کن صورتوں میں متحقق ہو گا؛ فدیہ کی مقدار متعین کرنے میں انصاف کیا ہے؛ اور اگر عورت اقتدار پر آمادہ ہو، لیکن مرد قبول نہ کرے تو ایسی صورت میں قاضی کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے؟ ان مسائل کی تفصیلات ہم کو خلع کے ان مفدمات کی رودادوں میں ملتی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے سائنس پیش روئے تھے۔

صدراول کے نظائر خلع کا سب سے زیادہ مشہور مقدمہ وہ ہے جس میں ثابت بن قیس سے ان کی بیویوں نے خلع حاصل کیا ہے۔ اس مقدمہ کی روداد کے مختلف ٹکڑے مختلف احادیث میں وارد ہوئے ہیں جن کو طاہر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثابت سے ان کی دو بیویوں نے خلع حاصل کیا تھا۔ ایک بیوی جمیلہ بنت ابی بن سلول (عبداللہ بن ابی کی بہن) کا قصہ یہ ہے کہ انہیں ثابت کی صورت ناپسند تھی، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خلع کے لئے مراجعہ کیا، اور ان الفاظ میں اپنی شکایت بیان کی۔

یا رسول اللہ! یجمع راسی ورسا، سہ
شیئاً ابدًا۔ اتی دفعت جانب الخباء فوالیتہ
اقل فی عداۃ فاذا ہوا شدہم سوادا و اقصرہم
قامة واقبہم وجہا۔ (ابن جریر)

یا رسول اللہ میرے اور اس کے سر کو کوئی چیز کبھی جمع
نہیں کر سکتی میں نے اپنا گھونگھٹ جو اٹھایا تو وہ سامنے
سے چند آدمیوں کے ساتھ آ رہا تھا میں نے دیکھا
کہ وہ ان میں سب سے زیادہ کالا اور سب سے
پستہ قد اور سب سے زیادہ بد شکل تھا۔

واللہ ما کرہت منہ دینا ولا خلقا
الا اتی کرہت و ما متہ (ابن جریر)

خدا کی قسم میں دین یا اخلاق کی کسی خرابی کے سبب
اس کو ناپسند نہیں کرتی بلکہ مجھے اس کی بد صدق ناپسند ہے۔

۵۔ بعض نے زینب بنت عبداللہ بن ابی کہا ہے مگر مشہور یہ ہے کہ ان کا نام جمیلہ تھا اور عبداللہ بن ابی کی بیٹی نہیں بلکہ بہن تھیں۔

واللہ لوکامحانۃ اللہ إذا دخل علی
 کبصقت فی وجهہ (ابن ماجہ)
 یا رسول اللہ بی من الجمال ما ترحی وثابت
 رجل دیمیم (عبدالرزاق بوالفتح الباری)
 وَمَا عْتَبَ عَلَيْهِ فِي خَلْقِ وَلَا دِينَ وَلَا كَتَبِي
 الْكُفْرَةَ فِي الْإِسْلَامِ (بخاری)
 خدا کی قسم اگر خون خزانہ ہوتا تو جب وہ میرے پاس آیا
 تھا اس وقت میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔
 یا رسول اللہ میں جیسی خوبصورت ہوں آپ دیکھتے ہیں زاد
 ثابت ایک بد صورت شخص ہے۔
 میں اس کے دین اور اخلاق پر کوئی حرج نہیں رکھتی
 مگر مجھے اسلام میں کفر کا خوف ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شکایت سنی اور فرمایا کہ اترو دین علیہ حد یقتہا التی اعطاک
 جو باغ تجھ کو اس نے دیا تھا وہ تو واپس کر دے گی؛ انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ بلکہ وہ زیادہ
 چاہے تو زیادہ بھی دوں گی۔ حضور نے فرمایا اما الزیادۃ فلا و لکن حد یقتہا۔ زیادہ تو نہیں
 مگر تو اس کا باغ واپس کر دے۔ پھر ثابت کو حکم دیا کہ اقبل الحد یقتہا و طلقها تطلیقۃ۔ باغ
 قبول کر لے اور اس کو ایک طلاق دے دے۔

ثابت کی ایک اور بیوی حبیبہ بنت سہل الانصاریہ تھیں جن کا واقعہ امام مالک اور ابو داؤد نے
 اس طرح نقل کیا ہے کہ ایک روز صبح سویرے حضور کا شانہ بنوری سے برآمد ہوئے تو حبیبہ کو کھڑا پایا۔
 دریافت فرمایا کہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ لا، نا، لا ثابت بن قیس (میری) اور ثابت کی نہیں
 بٹھ سکتی۔ جب ثابت حاضر ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ یہ حبیبہ بنت سہل ہے، اس نے بیان کیا جو کچھ اللہ نے
 چاہا کہ بیان کرے۔ حبیبہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جو کچھ ثابت نے مجھے دیا ہے وہ سب میرے پاس ہے حضور
 ثابت کو حکم دیا کہ وہ لے لے اور اس کو چھوڑ دے۔ بعض روایتوں میں خل سبیلہا کے الفاظ ہیں اور
 بعض میں فارقہا۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ابو داؤد اور ابن جریر نے حضرت عائشہ سے

لے۔ اسلام میں کفر کے خوف سے مراد یہ ہے کہ کرامت و نفرت کے باوجود اگر میں اس کے ساتھ رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں ان حکام
 کی پابند نہ رہ سکوں گی جو شوہر کی اطاعت اور اس کی وفاداری اور عصمت و عفت کے تحفظ کے لئے اللہ اور رسول نے دیے ہیں۔

اس واقعہ کو اس طرح روایت کیا ہے کہ ثابت نے جبیبہ کو اتنا مارا تھا کہ ان کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جبیبہ نے اگر حضور سے شکایت کی آپ نے ثابت کو حکم دیا کہ خذ بعض مالھا و قارقھا، اس کے مال کا ایک حصہ لے لے اور جدا ہو جا۔ مگر ابن ماجہ نے جبیبہ کے جو الفاظ نقل کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جبیبہ کو ثابت کے خلاف جو شکایت تھی وہ ماہرہٹ کی نہ تھی بلکہ بد صورتی کی تھی چنانچہ انہوں نے وہی الفاظ کہے جو دوسری احادیث میں جبیبہ سے منقول ہیں۔ یعنی اگر مجھے خدا کا خون نہ ہوتا تو میں ثابت کے منہ پر تھوکتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت اور مرد کا مقدمہ پیش ہوا۔ آپ نے عورت کو نصیحت کی اور شوہر کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیا۔ عورت نے قبول نہ کیا۔ اس پر آپ نے اُسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا جس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا تین دن نید رکھنے کے بعد آپ نے اُسے نکالا اور پوچھا کہ تیرا کیا حال رہا۔ اس نے کہا خدا کی قسم مجھ کو انہی تین راتوں میں راحت نصیب ہوئی ہے یہ سن کر حضرت عمر نے اس کے شوہر کو حکم دیا کہ اخلعھا و یحک ولو من فرطھا۔ اس کو قلع سے سے خواہ وہ اس کے کان کی بالیوں کے عوض ہی میں ہو رکشت الفہم ج ۲)

س بیع یدت معوذ بن عضران نے اپنے شوہر سے اپنی تمام املاک کے معاوضہ میں خلع حاصل کرنا چاہا۔ شوہر نے نہ مانا۔ حضرت عثمان کے پاس مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عثمان نے اس کو حکم دیا کہ اس کی چوٹی کا مویان تک لے لے اور اس کو خلع سے سے فأ جازکھا وامرکھا باخذ عقاصک یا سہا فنادو نہ۔ (عبدالرزاق)۔

احکام خلع ان روایات سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) فان یخفتم الا یقیم احدود اللہ کی تفسیر وہ شکایات ہیں جو ثابت بن قیس کی بیویوں سے منقول ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کی اس شکایت کو خلع کے لئے کافی سمجھا کہ ان کا شوہر بد صورت ہے اور وہ ان کو پسند نہیں۔ آپ نے ان کو خوبصورتی اور بد صورتی کے فلسفہ پر کوئی لکچر نہیں دیا۔

کیونکہ آپ کی نظر شریعت کے مقاصد پر تھی۔ جب یہ امر متحقق ہو گیا کہ ان عورتوں کے دل میں شوہر کی طرف سے نفرت و کراہیت بیٹھ چکی ہے تو اپنے ان کی درخواست کو قبول فرمایا، کیونکہ نفرت و کراہیت کے ساتھ ایک عورت اور مرد کو جبراً ایک دوسرے سے باندھ سکتے کے نتائج، دین اور اخلاق اور تمدن کے لئے طلاق و خلع سے زیادہ خراب ہیں اور ان سے مقاصد شریعت فوت ہونے کا خوف ہے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ خلع کا حکم نافذ کرنے کے لئے محض اس بات کا محقق ہو جانا کافی ہے کہ عورت اپنے شوہر کو ناپسند کرتی ہے اور اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔

۱۔ حضرت عمر کے فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ نفرت و کراہیت کی تحقیق کے لئے قاضی شرع کوئی مناسب تدبیر اختیار کر سکتا ہے تاکہ کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے اور بالیقین معلوم ہو جائے کہ ان دن و شوہر اب نباہ ہونا متوقع نہیں ہے۔

۳۔ حضرت عمر کے فعل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نفرت و کراہیت کے اسباب کا کھوج لگانا ضروری نہیں، اور یہ ایک معقول بات ہے، عورت کو اپنے شوہر سے بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر نفرت ہو سکتی ہے جن کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے اسباب بھی نفرت کے ہو سکتے ہیں جن کو اگر بیان کیا جائے تو سننے والا نفرت کے لئے کافی نہ سمجھے گا، لیکن جس کو ان اسباب سے رات دن سابقہ پیش آتا ہے اس کے دل میں نفرت پیدا کرنے کے لئے وہ کافی ہوتے ہیں۔ لہذا قاضی کا کام صرف اس واقعہ کی تحقیق کرنا ہے کہ عورت کے دل میں شوہر سے نفرت پیدا ہو چکی ہے۔

۴۔ قاضی عورت کو وعظ دیند کر کے شوہر کے ساتھ رہنے کے لئے راضی کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے، مگر اس کی خواہش کے خلاف اسے مجبور نہیں کر سکتا، کیونکہ خلع اس کا حق ہے جو خدا نے اس کو دیا ہے، اور اگر وہ اس امر کا اندیشہ ظاہر کرتی ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے میں وہ حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکے گی تو کسی کو اس سے یہ کہنے کا حق نہیں کہ تو چاہے حدود اللہ کو توڑ دے مگر اس خاص مرد کے

ساتھ بہر حال تجھ کو رہنا پڑے گا۔

۵۔ خلع کے مسئلہ میں دراصل یہ سوال قاضی شرع کے لئے متفقہ طلب ہی نہیں ہے کہ عورت آیا جائزہ ضرورت کی بنا پر طالب خلع ہے یا محض نفسانی خواہشات کے لئے علیحدگی چاہتی ہے۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خاقان راشدین نے قاضی کی حیثیت سے جب مقدمات خلع کی سماعت کی تو اس سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا کیونکہ ادل تو اس سوال کی کما حقہ تحقیق کرنا کسی قاضی کے بس کا کام نہیں۔ دوسرے خلع کا حق عورت کے لئے اس حق کے مقابلہ میں ہے جو مرد کو طلاق کی صورت میں دیا گیا ہے، ذوقاً قیبت کا احتمال دونوں صورتوں میں یکساں ہے مگر مرد کے حق طلاق کو قانون میں اس قیبت کے ساتھ مفید نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ذوقاً قیبت کے لئے استعمال نہ کیا جائے، پس جہاں تک قانونی حق کا تعلق ہے عورت کے حق خلع کو بھی کسی اغلاقی قیبت سے مفید نہ ہونا چاہئے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کوئی طالب خلع عورت وصال سے خالی نہ ہوگی۔ زیادہ فی الحقیقت خلع کی جائزہ ضرورت کھتی ہوگی یا محض ذوقاً ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اس کے مطالبہ کو رد کرنا ظلم ہوگا۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو اس کو خلع نہ دوانے سے شریعت کے اہم مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ جو عورت طبعاً ذوقاً ہے وہ تو اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر کرے گی۔ اگر آپ اس کو جائزہ طریقے سے ایسا نہ کرنے دیں گے تو وہ ناجائز طریقوں کی اپنی فطرت کے داعیاً کو پورا کرے گی اور یہ زیادہ برا ہوگا۔ ایک عورت کا پچاس شوہروں کو یکے بعد دیگرے بدلائنا اس سے بد بجا بہتر ہے کہ وہ کسی شخص کے قید نکاح میں رہے جو ایک مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے۔

۶۔ اگر عورت خلع مانگے اور شوہر اس پر راضی نہ ہو تو قاضی اس کو حکم دے گا کہ اسے چھوڑ دے۔ تمام روایات میں یہی آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے ایسی صورتوں میں مال قبول کر کے عورت کو چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے اور قاضی کا حکم بہر حال یہی معنی رکھتا ہے کہ محکوم علیہ اس کے امتثال کا پابند ہے حتیٰ کہ اگر وہ امتثال نہ کرے تو قاضی اس کو جس کر سکتا ہے شریعت میں قاضی

کی حیثیت صرف ایک مشیر کی نہیں ہے کہ اس کا حکم محض مشورہ کے درجہ میں ہو اور محکوم علیہ کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ہو۔

۷۔ خلع کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے مطابق ایک طلاق بائن کا ہے، یعنی اس کے بعد زمانہ عدت میں شوہر کو رجوع کا حق نہ ہوگا۔ کیونکہ حق رجوع باقی رہنے سے خلع کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے نیز چونکہ عورت نے جو مال اس کو دیا ہے وہ عقد نکاح سے اپنی رہائی کے معاوضہ میں دیا ہے، اس لئے اگر شوہر معاوضہ لے لے اور اس کو رہائی نہ دے تو یہ فریب اور دغا ہوگی جس کو شرعیت جائز نہیں رکھ سکتی۔ ہاں اگر عورت دوبارہ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو کہہ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ اُس قسم کی طلاق ہے جس کے بعد دوبارہ نکاح کرنے کے لئے تحلیل شرط نہیں ہے۔

۸۔ خلع کے معاوضہ کی تعیین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ جتنے معاوضہ پر بھی زوجین راضی ہو جائیں، اس پر خلع ہو سکتا ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہ فرمایا کہ شوہر خلع کے معاوضہ میں اپنے دیئے ہوئے مہر سے زیادہ مال لے آپ کا ارشاد ہے *لا یاخذ الرجل من المخلعة اکثر مما عطاها*۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی بالفاظ صریح اس کو مکروہ فرمایا ہے۔ ائمہ مجتہدین کا بھی اس پر اتفاق ہے بلکہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم کی وجہ سے خلع کا مطالبہ کرے تو شوہر کے لئے سر سے مال ہی لینا مکروہ ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے *وان كان النشوز من قبله بکراه له ان یاخذ منها عوضاً*۔ اس باب میں اصول شرع کے ماتحت یہ ضابطہ بنایا جا سکتا ہے کہ اگر خلع مانگنے والی عورت اپنے شوہر کا نشوز ثابت کر دے، یا خلع کے لئے ایسے وجوہ ظاہر کرے جو قاضی کے نزدیک معقول ہوں تو اس کو مہر کے ایک قلیل جز یا نصف کی واپسی پر خلع دلایا جائے اور اگر وہ نہ شوہر کا نشوز ثابت کرے، نہ کوئی معقول وجہ ظاہر کرے تو اس کے لئے پورا مہر یا اس کا ایک بڑا حصہ واپس کرنا ضروری قرار دیا جائے۔ اگر اس کے لئے میں قاضی کو ذوقیت کے آثار نظر آئیں تو قاضی سزا کے طور پر اس کو مہر سے بھی کچھ

زیادہ دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔

مسئلہ خلع میں ایک بنیادی غلطی خلع کی اس بحث سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ قانون اسلامی میں عورت اور مرد کے حقوق کے درمیان کس قدر صحیح توازن قائم کیا گیا تھا۔ اب یہ ہماری اپنی غلطی ہے کہ ہم نے اپنی عورتوں سے خلع کے حق کو عملاً سلب کر لیا، اور اصول شرع کے خلاف، عقدہ نکاح کو کلیتہً مردوں کی خواہش پر منحصر ٹھہرا دیا۔ اس سے عورتوں کی جو حق تلفیاں ہوئیں اور ہو رہی ہیں ان کی ذمہ داری خدا اور رسول کے قانون پر قطعاً نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اس قانون کو سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر اب بھی عورتوں کے اس حق کا استغناء ہو جائے تو وہ بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں گی جو ہمارے ازدواجی معاملات میں پیدا ہو گئی ہیں، بلکہ گتھیوں کا پیدا ہونا ہی بند ہو جائے گا۔

عورت سے خلع کے حق کو جس چیز نے عملاً بالکل سلب کر لیا ہے وہ یہ غلط خیال ہے کہ شارع نے خلع کا معاملہ کلیتہً زن و شوہر کے درمیان رکھا ہے اور اس میں مداخلت کرنا قاضی کے حدود اختیار سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خلع دنیا یا نہ دینا بالکل مرد کی مرضی پر موقوف ہو گیا ہے۔ اگر عورت خلع حاصل کرنا چاہے اور مرد اپنی شرارت یا خود غرضی سے نہ دینا چاہے تو عورت کے لئے کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ لیکن یہ بات شارع کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ شارع کا یہ منشاء ہرگز نہ تھا کہ معاملہ نکاح کے ایک فریق کو بالکل بے بس کر کے دوسرے فریق کے ہاتھ میں دے دے، اگر ایسا ہوتا تو وہ بلند اخلاقی و تمدنی مقاصد فوت ہو جاتے جو اس نے مناکحت کے ساتھ وابستہ کئے ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے اسلامی شریعت میں قانون ازدواج کی بنیاد اس صل پر رکھی گئی ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق جب تک پاکیزگی اخلاق اور عورت و درجہ کے ساتھ قائم رہ سکتا ہو اس کا استحکام تحسن اور ضروری ہے اور اس کو ٹوڑنا یا تڑوانے کی کوشش کرنا سخت نامحمود ہے، اور جب یہ تعلق دونوں کے لئے یا دونوں میں سے کسی ایک

کے لئے اخلاق کی خرابی کا سبب بن جائے یا اس میں مودت و درمت کی جگہ نفرت و کراہیت داخل ہو جائے تو پھر اس کا توڑ دینا ضروری ہے، اور اس کا باقی رہنا اغراض شریعت کے خلاف ہے۔ اس اصل کے ماتحت شریعت نے معاملہ نکاح کے دونوں فریقوں کو ایک ایک قانونی آلہ ایسا دیا ہے جس سے وہ عقدہ نکاح کے ناقابل برداشت ہو جانے کی صورت میں حل عقد کا کام لے سکتے ہیں۔ مرد کے قانونی آلہ کا نام طلاق ہے جس کے استعمال میں اسے آزادانہ اختیار دیا گیا ہے۔ اور اس کے بالمقابل عورت کے قانونی آلہ کا نام خلع ہے جس کے استعمال کی صورت یہ رکھی گئی ہے کہ جب وہ عقدہ نکاح کو توڑنا چاہے تو پہلے مرد سے اس کا مطالبہ کرے، اور اگر مرد اس کی خواہش پوری کرنے سے انکار کرے تو پھر قاضی سے مدد لے۔ زوجین کے حقوق میں توازن اسی طرح قائم رہ سکتا تھا، اور خدا و رسول نے درحقیقت یہی توازن قائم کیا تھا۔ مگر قاضی کے اختیار سماعت کو درمیان سے خارج کر کے یہ توازن بگاڑ دیا گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ قانونی آلہ جو عورت کو دیا گیا تھا قطعاً بے کار ہو گیا، اور عملاً قانون کی صورت بگڑ کر یہ ہو گئی کہ اگر مرد کو ازدواجی تعلق میں حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو یا یہ تعلق اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے تو وہ اسے قطع کر سکتا ہے، لیکن اگر یہی خوف عورت کو ہو یا ازدواجی تعلق اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے تو اس کے پاس اس تعلق کو قطع کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تاؤ تئیکہ مرد ہی اس کو آزاد نہ کرے وہ مجبور ہے کہ بہر حال اس تعلق میں بندھی رہے، خواہ حدود اللہ پر قائم رہنا اس کے لئے محال ہی کیوں نہ ہو جائے اور مناکحت کے شرعی مقاصد بالکل ہی کیوں نہ فوت ہو جائیں کیا کسی میں اتنی جسارت ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت پر اتنی کھلی ہوئی بے انصافی کا الزام عائد کر سکے؟

مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات | قرآن مجید کی جس آیت میں خلع کا قانون بیان کیا گیا ہے اس کو پھر پڑھئے۔

كَانَ حَقِّمًا لَا يَفِيأُ حُدُودًا لِلَّهِ
اگر تم کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہیں گے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ - تو ان دونوں پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ اپنی عورت (کچھ فدیہ دے کر) علیحدگی حاصل کر لے۔

اس آیت میں زوجین کا ذکر تو غائب کے صیغوں سے کیا گیا ہے، لہذا لفظ خِفْتُمْ کے مخاطب وہ نہیں ہو سکتے۔ اب لا محالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں اور حکم الہی کا منشا یہ ہے کہ اگر خلع پر زوجین میں تراضی حاصل نہ ہو تو اولی الامر کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کی تصدیق ان احادیث سے ہوتی ہے جو ہم اور پر نقل کر چکے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے پاس خلع کے دعوے لے کر عورتوں کا آنا اور آپ کا ان کی سماعت کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ جب زوجین میں تراضی حاصل نہ ہو تو عورت کو قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اب اگر فی الواقع قاضی کا فیصلہ اس معاملہ میں بے اثر ہو اور مرد کے راضی نہ ہونے کی صورت میں قاضی اس سے اپنا فیصلہ منوانے کا اقتدار نہ رکھتا ہو تو قاضی کو مرجع قرار دینا سرے سے فضول ہی ہو گا، کیونکہ اس کے پاس جانے کا نتیجہ بھی وہی ہے جو نہ جانے کا ہے۔ لیکن کیا احادیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قاضی اس معاملہ میں بے اختیار ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے جتنے فیصلے اور منقول ہوئے ہیں ان سب میں یا تو صیغہ امر آیا ہے جیسے طَلِقَهَا اور فَاذْقَهَا وَرَحِلَ سَبِيْلَهَا۔ یا یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے مرد کو حکم دیا کہ ایسا کرے۔ ابن جریر نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ تو یہ ہیں کہ فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا (پھر آپ نے ان کو جدا کر دیا)، اور یہی الفاظ اس روایت میں بھی ہیں جو خود جمیلہ بنت ابی بن سلول سے منقول ہے۔ اس کے بعد یہ شبہ کرنے کی کوئی کنجائش نہیں رہتی کہ قاضی خلع کے معاملہ میں حکم دینے کا مجاز نہیں۔ یہاں یہ سوال کہ اگر شوہر اس حکم کو محض مشورہ سمجھ کر ماننے سے انکار کر دے تو کیا قاضی اس سے جبراً اپنا حکم منوا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عہد میں ایسی تو کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی کہ آپ نے کوئی فیصلہ صادر کیا ہو اور کسی نے اس سے

سرکاری کی جرات کی ہو لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اُس فیصلہ پر ہم قیاس کر سکتے ہیں جس میں آپ نے ایک ہیکل شوہر سے فرمایا تھا کہ کسٹ بیادِ حِجرتی توضعی بمثل ما رضیت یہ۔ یعنی تجھے نہ چھوڑا جائے گا جب تک تو بھی اسی طرح حکمین کا فیصلہ قبول کرنے پر راضی نہ ہو جس طرح عورت راضی ہوئی ہے۔ اگر قاضی ایک شوہر کو حکمین کے فیصلہ پر تسلیم خم کرنے سے انکار کرنے پر حراست میں رکھ رکھتا ہے تو وہ خود اپنا فیصلہ منوانے کے لئے تو بدرجہ اولیٰ قوت استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے تمام معاملات میں سے صرف صلح ہی کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہو جسے قاضی کے اس حق سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ فقہ کی کتابوں میں متعدد جزئیات ایسے ملتے ہیں جن میں قاضی کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر شوہر اس کے حکم سے طلاق نہ دے تو قاضی خود تفریق کر لے۔ پھر کیوں نہ صلح کے مسئلہ میں بھی قاضی کو یہ اختیار حاصل ہو؟

آگے چل کر جو مباحث بیان ہوں گے ان سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جائے گی کہ عینین اور محبوب اور خصتی اور جذائی اور مردِ ص اور مجنون شوہروں کے مسئلہ میں فقہائے کرام نے جو ضوابط بیان کئے ہیں، اور اسی طرح خیار بلوغ اور بعض دوسرے مسائل میں جو اجتہادی قوانین مقرر کئے گئے ہیں ان کی موجودگی میں تو نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ عورتوں کو صلح دلانے کے پورے اختیار اور عدالتوں کو حاصل ہوں، ورنہ جو عورتیں ایسے حالات میں گرفتار ہو جائیں ان کے لئے بجز اس کے اور کوئی صورت ہی نہیں کہ یا تو وہ تمام عمر مصیبت کی زندگی بسر کریں، یا اپنے داعیاتِ نفس سے مجبور ہو کر فحش میں مبتلا ہو جائیں، یا مجبوراً مرد ہو کر قیدِ نکاح سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ تو صلح دعا کے لئے ہم یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

عینین کے معاملہ میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی۔ اگر علاج کے بعد وہ ایک مرتبہ بھی ہمبستری پر قادر ہو گیا حتیٰ کہ اگر ایک مرتبہ اس نے ادھوری مباشرت

بھی کر لی تو عورت کو فسخ نکاح کا حق نہیں بلکہ یہ حق ہمیشہ کے لئے باطل ہو گیا۔ اگر عورت کو نکاح سے پہلے یہ معلوم تھا کہ وہ عنین ہے تو اس کو سرے سے قاضی کے پاس دعوائے لے جانے کا حق ہی نہیں مگر اس نے نکاح کے بعد ایک مرتبہ مباشرت کی اور پھر عنین ہو گیا تب بھی عورت کو دعوائے کا حق نہیں۔ اگر عورت نے شوہر کے عنین ہونے کا علم حاصل ہونے کے بعد اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تب بھی وہ ہمیشہ کے لئے خیار فسخ سے محروم ہو گئی۔ ان صورتوں میں عورت کا خیار فسخ تو یوں باطل ہو گیا اس کے بعد ایسے ناکارہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خلع حاصل کرے۔ مگر وہ اس کو مل نہیں سکتا کیونکہ شوہر سے مطالبہ کرتی ہے تو وہ اس کا پورا نہیں بلکہ ہر سے کچھ زائد لے کر بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا اور عدالت سے رجوع کرتی ہے تو وہ اس کو مجبور کر کے طلاق دلوانے یا تفریق کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اب غور کیجئے کہ اس عزیز عورت کا حشر کیا ہو گا؟ بس یہی ناکہ یا تو وہ عیسائی راہبات کی طرح نفس کشی کی زندگی بسر کرے اور اپنے نفس پر روح فرسا تکلیفیں بٹھاتا کرے یا قید نکاح میں رہ کر اخلاقی فواحش میں مبتلا ہو یا پھر سرے سے دین اسلام ہی کو خیر باد کہہ دے۔

مگر کیا اسلامی قانون کا منشاء بھی یہی ہے کہ کوئی عورت ان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو؟ کیا ایسے ازدواجی تعلق سے شریعت کے وہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کے لئے قانون ازدواج بنا یا گیا ہے؟ کیا ایسے زوجین میں مودت و رحمت ہو گی؟ کیا وہ باہم مل کر تمدن

لہ فی الدرامختار عن المعراج اذا اوج الحشفة فقط طيس بعين وان كان مقطوعها فلا بد من جریة الذکر
 لہ فی العالمگیریہ ان علمت المرأة وقت النکاح انه عنین لا یصل الی النساء لا یکن نہا حق الخصومة
 لہ فی الدرامختار فلو جبت بعد وصولہ الیہا مترۃ او صار عنینا بعدہ ای الوصول لا یفرق
 لحصول حقها بالوطی مترۃ۔

یہ قال الشاخی قوله لم یبطل ای ما لہ نقل رضیت بالمقام معہ۔

کی کوئی مفید خدمت کر سکیں گے؛ کیا ان کے گھر میں خوشی اور راحت کے فرشتے کبھی داخل ہو سکیں گے؟ کیا یہ قید نکاح کسی حیثیت سے بھی احسان کی تعریف میں آسکے گی، اور اس سے دین اور اخلاق اور عفت کا تحفظ ہوگا؟ اگر نہیں تو بتایا جائے کہ ایک بے گناہ عورت کی زندگی برباد ہونے یا مجبوراً اس کے فواحش میں مبتلا ہونے، یا دائرہ دین سے نکل جانے کا وبال کس کے سر ہوگا؟ خدا اور رسول تو یقیناً بری الذمہ ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے قانون میں کوئی نقص نہیں چھوڑا ہے۔

قضاء شرعی

طلاق اور خلع کی بحث میں قانون اسلامی کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ قانون اس قاعدہ کلیہ پر وضع کیا گیا ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق اگر قائم رہے تو حدود اللہ کی حفاظت اور مودت و رحمت کے ساتھ قائم رہے جس کو قرآن میں امساک بالمعروف کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اگر اس طرح ان کا باہم مل کر رہنا ممکن نہ ہو تو تسریع باحسان ہونا چاہئے، یعنی جو میاں بیوی سیدھی طرح مل کر نہ رہ سکتے ہوں وہ سیدھی طرح الگ ہو جائیں اور ایسی صورتیں پیدا نہ ہونے پائیں کہ ان کے اختلاف سے نہ صرف ان کی اپنی زندگی تلخ ہو بلکہ خاندانوں میں فتنے برپا ہوں اور سڑی میں گندگی پھیلے، اخلاقی مفاسد کی اشاعت ہو اور آئندہ نسلوں تک ان کے برے اثرات متعدي ہو جائیں اپنی خرابیوں کا سدباب کرنے کے لئے شریعت نے مرد کو طلاق اور عورت کو فلع کا حق دیا ہے تاکہ اگر وہ چاہیں تو خود تسریع باحسان کے اصول پر عمل کر سکیں۔ لیکن بہت سی ایسی جھگڑاؤں طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جو نہ امساک بالمعروف پر عمل کر سکتی ہیں اور نہ تسریع باحسان پر آمادہ ہوتی ہیں نیز ازدواجی معاشرت میں ایسی صورتیں بھی پیش آجاتی ہیں جن میں زوجین کے درمیان یا تو حقوق کے باپ میں اختلاف واقع ہوتا ہے یا امساک بالمعروف اور تسریع باحسان دونوں پر عمل کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے شریعت نے طلاق اور خلع کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ بھی حقوق کے تصفیہ اور حدود کی حفاظت کے لئے مقرر کر دیا ہے جس کا نام قضاء شرعی ہے۔

قبل اس کے کہ ان مسائل کو بیان کیا جائے جو قضائے شرعی سے تعلق رکھتے ہیں چند اصولی مباحث

کی توضیح ضروری ہے۔

قضا کے لئے اولین شرط | قضا شرعی کی جو شرائط تفصیل کے ساتھ کتب فقہ میں مذکور ہیں، ان میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ قاضی لازماً مسلمان ہونا چاہئے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جس کو فقہانے تبصریح بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اصول شرع کے تحت شرعی معاملہ میں مسلمانوں پر غیر مسلم حاکم کا حکم خواہ ظاہراً نافذ ہو جائے مگر باطناً نافذ نہیں ہو سکتا، مثلاً اگر ایک غیر مسلم حاکم ایک مسلمان کا نکاح فسخ کرے تو خواہ اس کا یہ حکم احکام شرع کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، اور زوجین میں عملاً تفریق ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن درحقیقت نہ اس کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہوگا اور نہ شرعاً عورت کے لئے دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔ اگر وہ نکاح کرے گی تو اس کا نکاح باطل ہوگا اور اسلامی شریعت کی نگاہ میں اس کی اولاد ناجائز ہوگی۔ قرآن غیر اسلامی عدالت اور غیر مسلم حاکم کے فیصلہ کو اول تو اصولاً ہی تسلیم نہیں کرتا۔ پھر مسلمانوں کے معاملہ میں خصوصاً اس کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ ان پر غیر مسلم کا حکم اللہ کے نزدیک مستم نہیں ہے۔ اس مسئلہ کی پوری توضیح میں اپنے مضمون "ایک نہایت اہم استفتاء" میں کرچکا ہوں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جن مسائل کا تفسیہ قاضی کے فیصلہ پر چھوڑا گیا ہے ان کے لئے اگرچہ شریعت میں مفصل قوانین موجود ہیں لیکن شخصی معاملات میں ہر مقدمہ کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر ان قوانین کی صحیح تعبیر و تفسیر اور اصول قانون سے حسب موقع جزئیات کا استنباط، اور روح قانون کے مطابق فصل خصومات کے جملہ شرائط کا لحاظ، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ قاضی میں قوت اجتہاد اور اس کے ساتھ اعتقاداً اس قانون کا احترام بھی موجود ہو جس کو نافذ کرنے کے لئے وہ منصب قضا پر مامور ہو ہے، اور یہ دونوں باتیں اسی شخص میں متحقق ہو سکتی ہیں جو مذہباً مسلمان ہو، اسلامی قانون کے اصول و فروع پر عادی ہو، اس کی سپرٹ کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ اس کے اصل ماخذ پر دست رس رکھتا ہو، اور مسلم سوسائٹی کے نظام ترکیبی سے اندرونی طور پر بھی واقف ہو۔ ایک غیر مسلم جج میں ان صفات کا پایا جانا کسی طرح ممکن نہیں اور اس وجہ سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ مسلمانوں کے شرعی معاد کا صحیح فیصلہ کر سکے گا۔

ہندوستان میں قضا شرعی | ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۱۸۶۳ء تک مسلمانوں نے ہونے کے نقصانات کے شرعی معاملات کا تصفیہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے جن کا انتخاب علماء کے گروہ میں سے کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد منصب قضا منسوخ کر دیا گیا، اور عام دیوانی معاملات کی طرح شرعی معاملات بھی انگریزی عدالتوں کے حدود اختیار میں داخل کر دیئے گئے۔ اس کا پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ اصول شریعت کے مطابق جس چیز پر قضاے شرعی کا اطلاق ہوتا ہے وہ قریب قریب بالکل معدوم ہو گئی، اور مسلمانوں کے لئے اپنے شرعی معاملات میں ان عدالتوں سے ایسا فیصلہ حاصل کرنا غیر ممکن ہو گیا جو ان کے مذہب کی مدد سے جائز شرعی فیصلہ کہا جاسکتا ہو۔ دوسرا نقصان جو اہمیت میں پہلے نقصان سے کسی طرح کم نہیں، یہ ہے کہ ان عدالتوں کے پاس نہ وہ ذرائع ہیں جن سے وہ قانون اسلامی کے اصول و فروع پر اتنی وسیع نظر بہم پہنچا سکتے ہوں کہ ان میں صحیح قوت اجتہاد پیدا ہو جائے۔ اور ننان کے دل میں اس قانون کا اتنا احترام موجود ہوتا ہے کہ اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو تامل ہو۔ ان کے علم کا مادہ جن کتابوں پر ہے وہ ایسے معنفین کی لکھی ہوئی ہیں جو عربی سے ناواقف تھے قانون کے اصلی ماخذ سے بے بہرہ تھے اور اصطلاحات قانون تک کو سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے، مثلاً ہملٹن (Hamilton) جس نے ایک فارسی شرح کی مدد سے ہدایہ کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ وہ غریب ہدایہ کو سمجھنے کی قابلیت ہی نہ رکھتا تھا، اور فقہ کی معمولی اصطلاحات میں بھی اس نے اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ اکثر مقامات پر اصل ہدایہ کی طرف رجوع کئے بغیر اس کی عبارت سمجھ میں نہیں آسکتی اور بیلی (Baillie) جس کا (Digest of Mohommada: Law) فتاویٰ عالمگیری کے اقتباسات کے ترجمہ سے ماخوذ ہے۔ اور میکناٹن (Macnaghton) جس کی کتاب

(Principles of Mohamadan Law) ناقص معلومات اور اس پر ناقص فہم و تعبیر کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ انگریزی عدالتیں خود اپنے دائرہ معلومات کی اس تنگی کا اعتراف کرتی ہیں، چنانچہ

لئے یہاں اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ میں اصولاً اس قضا شرعی کی صحت کا معتقد نہیں ہوں جو غیر اسلامی حکومت کے اذن سے

..... ساہوکارانہ طور پر اس سے اسلامی حکومت قائم ہونے تک (باقی صفحہ ۳۱۳)

جلس مارکی ایک مقدمہ کے فیصلہ میں لکھا ہے :-

”شرع اسلام کو معلوم کرنے کے جو ذرائع عدالت کو حاصل ہیں وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں ... کہ میں اس سے تعلق رکھنے والے مسائل کے تصفیہ سے بچنے کے ہر طریقہ کو اختیار کرنے پر

بخوشی آمادہ ہوں“

مگر ایسی محدود معلومات کے ساتھ یہ عدالتیں اسلامی قانون میں اجتہاد کرنے کی جرأت کرتی ہیں اور اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا کیونکہ نہ اس قانون کا احترام ان کے عقائد میں داخل ہے، اور نہ حکومت مستط کے نظام عدلیہ کی طرف سے ان پر کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قانون کے حدود سے تجاوز نہ کر سکیں۔ ایک مقدمہ کے فیصلہ میں چیف جسٹس گارنٹھ نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ ان عدالتوں کی صحیح پوزیشن کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں

”قانون اسلام جس کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے اور جو قدیم کتابوں میں مندرج ہے اب سے ملتا

پہلے بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک میں جاری ہوا تھا جن کے قانونی اور تمدنی حالات

ہندوستان کے حالات بالکل مختلف تھے۔ اگرچہ ہم ایسے مقدمات میں جو مسلمانوں کے درمیان جیتے

ہیں حتی الامکان احکام شرع اسلامی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اصل تو یہی

معلوم کرنا مشکل ہے کہ دراصل وہ احکام کیا تھے، پھر ان اختلافات میں توفیق دینا بھی مشکل ہے

جو اکابر مجتہدین یعنی امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ کے درمیان بکثرت پیش آئے ہیں اس لئے

امکانی حد تک ہمیں اس صحیح اصول کو دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جس پر کوئی

حکم مبنی ہو، اور پھر قواعد انصاف، نیک نیتی اور دوسرے ملکی قوانین اور تمدنی حالات

کو پیش نظر رکھ کر اسے نافذ کرنا چاہئے“

۱۷ خواجہ حسین بنام شہزادی ہزاری بیگم۔

۱۸ ملک عبدالغفور بنام ملیکا۔

(بقیہ صفحہ ۵۲) ہندوستانی مسلمانوں کے شرعی معاملات بدرجہہ آخر درست ہو سکتے ہیں۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک حاکم عدالت جو اسلامی قوانین سے اپنی ناواقفیت کا معترف ہے اور حکامات ائمہ میں توفیق دینے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا، وہ اسلامی قوانین میں اس ناقص علم کے ساتھ اجتہاد سے کام لینے کو علائقہ جائز ٹھیراتا ہے، اور اُسے ایک عدالتی فیصلہ میں یہ بات ظاہر کرتے ہوئے کوئی تامل نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں پر اسلامی قانون کو نافذ کرنے میں صرف اسلامی قانون ہی کے حدود کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسرے قوانین ملکی اور تمدنی حالات، اور قواعد انصاف کے متعلق خود اپنے نظریات کا لحاظ کرتا بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ یہ اسی اجتہاد بلا ایماں و علم کا نتیجہ ہے کہ جو اوصو اور ناقص قانون محمدن لاکے نام سے ہمارے ملک کی عدالتوں میں متداول ہے اس کا بھی ٹھیک ٹھیک نفاذ ہمارے شرعی معاملات میں نہیں ہوتا اور عدالتی فیصلوں سے اُس کی صورت روز بروز منسوخ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اصلاح کی راہ میں پہلا قدم | اس معاملات نکاح و طلاق اور دوسرے شرعی معاملات میں صحیح فیصلے حاصل کرنے کی کم سے کم اگر کوئی صورت ہے تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس ملک میں تہذیبی خود اختیار (Cultural autonomy) حاصل ہو جس کے ماتحت مسلمان اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے خود اپنے محاکم شرعیہ قائم کرنے کے مجاز ہوں، اور ان محکموں میں ایسے متقی علماء قاضی کی حیثیت سے مقرر کئے جائیں جو قانون شریعت میں فقہانہ بصیرت رکھتے ہوں۔ یہ ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر حقیقت میں مسلمانوں کے دوسرا ہونے کی حیثیت سے یہاں زندگی بسر کرنا محال ہے۔ اور اگر یہ چیز بھی انہیں حاصل نہ ہو تو ہر سبیل منزل اتنا ہی (اور یہ انتہائی مجبوری کی حالت میں باخوری صورت ہے) کہ مذہب مالکی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچائت مقرر کی جائے جس کے ارکان پر عموماً اس ضلع کے مسلمانوں کو اعتماد ہو اور جن میں سے کم از کم ایک رکن مستند عالم دین ہو۔ پھر حکومت متسلطہ پر دباؤ ڈالکر اس سے اس پنچائتی نظام کو تسلیم کرایا جائے اور اس سے یہ منوایا جائے کہ مسلمانوں کے معاملات نکاح و طلاق وغیرہ میں پنچائت کے فیصلوں کی حیثیت عدالتی فیصلوں کی سی ہوگی، اور انگریزی عدالتوں میں اُن کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی

اور خود انگریزی عدالتوں میں جو مقدمات نکاح و طلاق وغیرہ پیش ہوں گے، ان کو بھی پنچایتوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔ برٹش انڈیا کے علاوہ غیر مسلم ریاستوں، اومان مسلمان ریاستوں میں بھی جنہوں نے انگریزی حکومت کی تقلید میں قضاے شرعی کو موثقت کر کے شرعی معاملات کو عام دیوانی عدالتوں کے دائرہ سماعت میں داخل کر دیا ہے، اصلاح معاملات کے لئے سب سے پہلے یہی کوشش ہونی چاہئے کہ یا تو قضاے شرعی کا بند و لبت کیا جائے یا پھر پنچایتی سسٹم قائم کر کے اس کو ان ریاستوں سے تسلیم کرایا جائے۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو مجالس وضع قوانین میں کسی مسودہ قانون کو پیش کرنا اسلای اعراض کے لئے ہرگز سود مند نہ ہوگا۔

ایک جدید مجموعہ قوانین کی ضرورت انتظام قضا، شرعی کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے، اور وہ ایک ایسے کتابچہ کی تدوین ہے جس میں مسلمانوں کے شرعی معاملات کے متعلق فقہی احکام کو دفعات کی شکل میں تشریحات سمیت مرتب کر دیا جائے، تاکہ محاکم ٹریبونل یا پنچایتوں میں موجود انگریزی محڈن لاکا جگہ اس کو دلج دیا جاسکے۔ مصر میں جب (Mixed tribunals) قائم کئے گئے تھے تو وہاں بھی ایسے ایک مجموعہ قوانین (Code) کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جس میں نہایت مستند ماخذ سے تمام ضروری قوانین یکجا مرتب کر دیئے گئے ہوں، چنانچہ حکومت مصر کے ایما سے قدسی پاشا کی ہدایت میں علماء اوزہر کی مجلس نے اس کام کو انجام دیا، اور اس مجلس کے مرتب کئے ہوئے مجموعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے عدالتوں میں رائج کیا گیا۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی ایسی مجلس مقرر کی جائے جس میں ہر گروہ کے لئے خفیہ کے نزدیک پنچایت کا فیصلہ قضا، قاضی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر یہ پنچایتیں اپنے فیصلے نافذ کرنے کا اقتدار رکھتی ہوں اور ان کے اختیارات سماعت محض ثالثانہ نہیں بلکہ حاکمانہ نوعیت کے ہوں۔ تو وہب حنفی کے مطابق بھی ان کے فیصلے قضا، شرعی کے حکم میں ہوں گے۔

۱۷ اس مجموعہ کا ترجمہ فرینچ زبان میں (Droit Mussulman) کے نام سے شائع ہوا ہے اور مصر کے علاوہ دوسرے مسلم ممالک کی عدالتوں میں بھی اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

پچھلے علماء و چند ماہرین قانون کے ساتھ مل کر ایک مفصل ضابطہ اضرفدی تشریحات کے ساتھ مرتب کریں، اس ضابطہ کو ابتداءً ایک مسودہ کی شکل میں شائع کر کے مختلف جماعتوں کے علماء کی رائے دریافت کی جائے پھر ان آراء اور تنقیدات کا مناسب لحاظ کر کے اس پر نظر ثانی کی جائے اور جب یہ ضابطہ اپنی آخری صورت میں مرتب ہو جائے تو اسے احکام شرعیہ کا مستند مجموعہ قرار دے کر یہ طے کر دیا جائے کہ آئندہ سے مسلمانوں کے شرعی معاملات کے لئے اسی مجموعہ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور انگریزی عدالتوں کے نظائر اور غیر اہل علم و ایمان جموں کی تشریحات سے جو ٹھن لانا تیار ہو رہے وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ تب ہماری کتب فقہ میں تمام مسائل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں تو ایک نیا مجموعہ مرتب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ اعتراض صرف ممکن ہی نہیں بلکہ ایک گروہ کی ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقین ہے کہ اس تجویز کی ضرورت مخالفت کی جائے گی، اس لئے ہم اختصار کے ساتھ وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ کام ضروری ہے۔

یہ بات تو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل منقش ہیں، قدیم طرزینا و انداز ترتیب پر لکھے ہوئے ہیں اور ایسی زبان میں ہیں جس کی اصطلاحی باریکیوں کو اب عموماً وہ لوگ بھی طرح نہیں سمجھتے جو ان کتابوں کا درس دیتے ہیں۔ آج کل قانون کی کتابوں میں جس طرح احکام کو دفعہ در بیان کیا جاتا ہے اور پھر ہر دفعہ کے نیچے اس کے خاص خاص الفاظ کی تشریح، اس کے مقصد کی توضیح، اس کے تحت آنے والے اور اس کے تحت نہ آنے والے جزئیات کی تفصیل دی جاتی ہے اور معتبر حکام کے نظائر اور مختلف ماہرین کی تعبیرات جس طرح منفع صورت میں بیان کی جاتی ہیں اور فہرستوں اور انڈکسوں سے مسائل کے تلاش کرنے میں جو آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہیں، ان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار نہ کرے گا کہ انسانی کوششوں سے مدد و تریب کے فن میں جو ترقی ہوئی ہے اس کے کتب فقہیہ کی تدوین جدید میں ضرور کام لیا جانا چاہیے۔ آخر قدیم طرز تدوین کوئی منصوص

مشروع طرز تو نہ تھا کہ اس کی پابندی لازم اور اس سے تجاوز گناہ ہو۔

لیکن اس سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ قدیم فقہی کتابوں میں جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر عام انسانی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان احکام کو لفظ بلفظ لے کر ہر جگہ ہر معاملہ پر بے تکلف جاری کر دینا اصلاً غلط ہے۔ ان کی صحیح تنفیذ موقوف ہے اس پر کہ :-

اولاً جس اسلامی جماعت میں ان کو نافذ کیا جا رہا ہے اس کی اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالت کو پیش نظر رکھا جائے، یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کے اجتماعی عادات و خصائل اور رسم و رواج کس قسم کے ہیں۔ وہ کس ماحول میں رہتے ہیں۔ اس ماحول کے ان پر کیا اثرات ہیں۔ ان کی سیرت اور ان کے معاملات میں اسلام کا اثر کس قدر قوی یا ضعیف ہے، بیرونی اثرات سے ان کے اسلامی خصائص میں کس قدر فرق واقع ہوا ہے اور عام تمدنی حالات سے معاملات کی فقہی حیثیت میں کیا تغیرات رونما ہوئے ہیں۔

ثانیاً ہر مقدمہ کے مخصوص انفرادی حالات پر نظر رکھی جائے۔ فریقین کی سیرت، عمر، تعلیم، جسمانی حالات، معاشی و تمدنی حیثیت، گزشتہ تاریخ، خاندانی روایات اور ان کے طبقہ کی عام حالت سب پر نگاہ ڈال کر رائے قائم کی جائے کہ ایک خاص جزئی معاملہ میں ان پر قانون کا نفاذ کس طریقہ سے کیا جائے جس سے قانون کا مقصد بھی ٹھیک ٹھیک پورا ہو جائے، اور اصول قانون سے انحراف بھی نہ ہونے پائے۔

ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی شخص فقہ کی کسی ہدائی کتاب میں سے ایک جزئیہ نکالے اور آنکھیں بند کر کے اس کو ہر اس مقدمہ میں جو اس جزئیہ سے تعلق رکھتا ہو چھپان کر تاجلا جائے تو اس کی مثال اس طبیب کی سی ہوگی جو بقراط اور جالینوس کے نسخے لے کر بیٹھ جائے، اور ملک کی آب و ہوا، موسم، مریضوں کے مزاج، اور امراض کی جداگانہ کیفیتوں سے آنکھیں بند کر کے ان نسخوں کو برتا شروع کر دے۔ حکمائے قدیم کے مرتب کئے ہوئے نسخے اپنی جگہ نہایت صحیح اور حکیمانہ تھے، مگر وہ اس لئے کب مرتب کئے گئے تھے کہ جاہل عطار ان کو برتنیں؟ انہیں استعمال کرنے کے لئے بھی علم، تجربہ،

حکمت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح ائمہ مجتہدین نے شریعت کے قواعد اور اساسی احکام سے جو جزئی مسائل مستنبط کئے ہیں وہ اپنی جگہ نہایت درست سہی لیکن یہ بات تو ان بزرگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوگی کہ ان اجتہادی احکام کو تفقہ اور تدبیر کے بغیر اس طرح استعمال کیا جائے گا جیسے ڈاک خانہ کی مہر کو ایک جاہل چپڑا سی ہر بے فہم پر لگانا چلا جائے۔

قانون اسلام ایسے حکیمانہ اصول پر بنایا گیا تھا کہ اس کے ماتحت کسی مرد یا عورت کا مجبوراً ایذا یا مہلتا ہونا، یا سوسائٹی میں موجب فتنہ و فساد بن جانا قریب قریب محال تھا، اور یہ تو بالکل ہی ناممکن تھا کہ اس قانون کی کسی سختی سے مجبور ہو کر کوئی مسلمان عورت یا مرد دائرہ اسلام سے نکل جائے۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ صرف بے شمار خاندانی جھگڑے بلکہ سخت اخلاقی مناسبات حتیٰ کہ ارتداد تک کے واقعات محض اس وجہ سے رونما ہو رہے ہیں کہ اکثر معاملات میں قانون اسلام کے تحت لوگوں کے لئے صحیح اور عادلانہ فیصلہ حاصل کرنا محال ہو گیا ہے۔ فقہ اور تدبیر نہ مفتیوں میں ہے نہ حکام عدالت میں، ان میں سے کوئی بھی نہیں دیکھتا کہ ہم ایک عام حکم کو جس ملک جس سوسائٹی اور جس خاص مقدمہ میں نافذ کر رہے ہیں اس کی کون کونسی خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر اس حکم کے عموم میں اصول شریعت کے ماتحت تخصیص کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ شریعت کے مقاصد میں سے کوئی مقصد فوت نہ ہونے پائے اور اصول میں کسی اصل کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔ جہاں تک حکام عدالت کا تعلق ہے ان کی معذوری تو ظاہر ہے، یہے علماء تو ان میں سے بعض تو اس سے زیادہ کی استعداد ہی نہیں رکھتے کہ قدیم کتب فقہ میں جو جزئیات جس عبارت کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک اسی عبارت کے ساتھ نکال کر پیش کر دیا کریں، اور بعض کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے وسعت نظر اور تفقہ فی الدین سے فرزد کیا ہے، لیکن فرداً فرداً ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ کسی مسئلہ میں فقہ سے کام لے کر کسی عقیم

جزئیہ کی عبادت سے یک سر مو بھی انحراف کر جائیں، کیونکہ ایک طرف خود انہیں اپنے مبتلائے غلط ہونے کا خوف اس جرأت سے باز رکھتا ہے اور دوسری طرف یہ خوف دامنگیر ہوتا ہے کہ دوسرے علماء کی طرف سے ان پر غیر مقلدیت کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہر صوبہ کے جلیل القدر اور با اثر علماء کی ایک جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اجتماعی قوت و اثر سے کام لے کر شرعی معاملات کے لئے ایسا ضابطہ مرتب کرے جو مسلمانان ہند کی موجودہ اخلاقی تمدنی اور معاشی حالت کے مناسب و مکمل ہو اور جس میں اتنی لچک بھی ہو کہ مخصوص انفرادی حالات میں اصول کے تحت جزئی احکام کے اندر مناسب تغیر کیا جاسکے۔

اگر کوئی شخص اس طریقہ کو "غیر مقلدیت" قرار دیتا ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے اور نہیں سمجھتا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید اور انبیاء کی تقلید میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ جاہل کی تقلید اور عالم محقق کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہئے۔ اسے اتنا قوت بھی نہیں کہ کسی مذہب فقہی کا اتباع کرنے کے معنی کیا ہیں اس نے تقلید کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ اپنے مذہب فقہی کو بنزلہ دین، اور اس مذہب کے امام کو بنزلہ نبی، اور اس کے مسائل کو نصوص کتاب اللہ کی طرح اٹل سمجھا جائے، اور یہ بات عقیدہ کے طور پر دل میں بٹھالی جائے کہ اس مذہب کے کسی مسئلہ میں اصلاح ترمیم اور اضافہ تو درکنار اس پر تحقیق اور تنقید کی نظر ڈالنا ہی گناہ عظیم ہے اور کسی مسئلہ میں اس مذہب کے کسی جزئیہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب فقہی سے کوئی جزئیہ اخذ کرنا زائد اجتہاد یعنی چوتھی صدی ہجری تک تو صلال تھا مگر اس کے بعد حرام ہو گیا۔ لیکن اس طرح کی تقلید علماء سلف میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں، اور نہ اس کے لئے کوئی شرعی ثبوت کہیں مل سکتا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ کے تلامذہ نے سیکڑوں مسائل میں اپنے امام سے اختلاف کیا اور اس کے باوجود وہ حنفیت سے خارج نہ ہوئے علماء احناف نے امام اعظم اور ان کے تلامذہ کے اختلافات میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو ترک کر کے بعض کو مفتی بہ قرار دیا مگر اس تحقیق و تنقید کے باوجود کوئی ان کو

غیر مقلد نہیں کہہ سکتا۔ چوتھی صدی ہجری سے یکراٹھوں اور نویں صدی تک کے علمائے احناف متقدمین کے اجتہادی مسائل میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کرتے رہے اور حسب ضرورت دوسرے ائمہ مجتہدین کے دوسرے مذاہب سے مسائل اخذ کر کے ان کے مطابق فتوے دیتے رہے مگر کسی نے اس اجتہاد پر غیر مقلدیت کا حکم نہیں لگایا۔ کسی میں یہ جرأت نہیں کہ ابواللیث سمرقندی شمس الاممہ بخاری صاحب بدایہ، قاضی خاں، صاحب کنز، علامہ شامی اور ایسے ہی دوسرے علماء کو معصن اس بنا پر غیر مقلد کہہ دے کہ انہوں نے مذہب حنفی کے مسائل میں اپنے زمانے کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے لچک پیدا کی اور جن معاملات میں اس مذہب کے بعض احکام کو موجب ضروریات عام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ناقابل عمل پایا ان میں دوسرے مذاہب فقہیہ کے مطابق فتویٰ دیا اور اس بات کو مذہب حنفی کے اصول میں داخل کر لیا کہ بوقت ضرورت مذہب غیر پر حکم اور فتویٰ دینا جائز ہے بشرطیکہ اس میں اتباع عھوانہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اگر لوگ بطور خود اپنی ضرورتوں کے مواقع پر دوسرے مذاہب کے مطابق عمل کرنے یا خود اپنے مذہب کی رخصتوں سے فائدہ اٹھانے میں آزادی ہتھی تو اندیشہ ہے کہ اس سے اتباع ہوا اور تلفیق خارق اجماع اور تضحیح رخص مذاہب اور تلامب بالذین کا دروازہ کھل جائے گا اور معاملات میں سخت ابتزری پیدا ہوگی لیکن اگر علمائے دین تقویٰ اور نیک نیتی کے ساتھ باہم مشورہ کر کے مسلمانوں کی ضروریات اور حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا کریں، تو اس میں کسی دینی یا دنیوی نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ اگر کسی مسئلہ میں نارائستہ ان سے غلطی بھی ہو تو نصوص صریحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حق تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا، ورنہ ان کی نیک نیتی کا ان کو اجر دے گا۔ اس راستہ کو اختیار کرنے میں تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی خطرہ ہے کہ ایک جماعت ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگی اور ان کے متبعین میں سے بھی ایک گروہ ان سے بدظن ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بڑا خطرہ اس راستہ کو

اختیار نہ کرنے میں ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی ضرورتوں سے تنگ آکر قانون اسلامی کے بجائے ہوئے نفس کا اتباع کریں گے اور ان میں تلاءب بالمدین اور حدود اللہ کی خلاف ورزی اور دین و اخلاق کی خرابی، اور کفر و معصیت کی دباؤں پھیلے گی اور عیسائی قوموں کی طرح وہ بھی اپنے مذہب کے قانون کو چھوڑ کر انسانی قوانین کو اختیار کر لیں گے تو قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اسی لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسی لئے تھی کہ تم اس کو لٹے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو کسیر بنا یا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے عسیر بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا، تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟ ہم نے ہر شکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے نئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کفر الدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔ البتہ جہاد کو یہ جواب دہی کرنے کا موقع ضرور مل جائے گا کہ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيلَا رَبَّنَا اِنْتُمْ ضَعُفْتُمْ مِّنَ الْعَذَابِ وَالْعُنُومُ لَعْنَا كَبِيْرًا۔

یہ ضمنی بحثیں چونکہ ضروری اور اہم تھیں اور ان کا تفصیلی بیان ناگزیر تھا اس لئے ان کو اتنی جگہ دینی پڑی اس کے بعد ہم اپنے اصل بحث کی طرف رجوع کریں گے۔

اصولی ہدایات | قرآن مجید چونکہ ایک اصولی کتاب ہے اس لئے ان جزئی مسائل کو جو ازواجی معاملات کی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں اس میں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے لیکن چند ایسے وسیع اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جو تقریباً تمام جزئیات پر حاوی ہیں اور جزئیات کی تخریج میں بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔ پس قانون کی تفصیلات

پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے قواعد اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے:

(۱) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتَّىٰ يُوْمِنُوْا بِالْحَدِيْثِ
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْدُوْا لِكِتَابِ (۱-۵)

ان آیات میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرک عورت سے نہیں ہو سکتا، البتہ اہل کتاب کی عورتیں اس کے لئے حلال ہیں۔ مگر مسلمان عورت نہ مشرک کے نکاح میں آ سکتی ہے نہ اہل کتاب کے۔

رہو وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتَّىٰ يُوْمِنُوْا بِالْحَدِيْثِ (۱-۵) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتَّىٰ يُوْمِنُوْا بِالْحَدِيْثِ (۱-۵) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتَّىٰ يُوْمِنُوْا بِالْحَدِيْثِ (۱-۵)

ان آیات سے یہ قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کو خود اپنا نکاح کرنے کا کلی اختیار حاصل ہے، اور اس میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں۔ لیکن عورت کے نکاح میں اس کے اولیاء اور عزیز و قریب مردوں کی رائے کا دخل بھی ہے یعنی وہ اپنے نکاح کے معاملہ میں بالکل آزاد نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث الایما حق بنفسہا من ولیہا اور لا تنکح البکر حتی تستاذن کی رو سے نکاح کے لئے عورت کی رضامندی ضروری ہے، اور کسی کو اس پر جبر کرنے کا حق حاصل نہیں، مگر چونکہ عورت کے نکاح کا مسئلہ خاندان کے مفاد سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے قرآن مجید نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ شادی کے معاملہ میں تنہا عورت کی خواہش کافی نہیں بلکہ اس کے رشتہ دار مردوں کی رائے کو بھی اس میں دخل ہے۔

(۳) فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّؤْتِيَنَّكُمْ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (۳-۴) وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَ
وَقَدْ اُنْفَضِيَ بَعْضُكُمْ اِلَىٰ بَعْضٍ (۳-۴) يَاۤ اِنَّ تَحْسَبُوْنَ
فَيَنْصِفُ مَا قَرَضْتُمْ (۲-۳)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر اس موقع کا عرصہ ہے جو مرد اپنی بیوی کی مقاربت سے حاصل کرتا ہے۔ لہذا مقاربت کے بعد ہی پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور کسی صورت میں وہ ساقط نہیں ہو سکتا، البتہ عورت

یا تو اپنی خوشی سے معاف کرے (فَإِنْ طِبَّنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ لَفَسَا فَكُلُوهُ هَدِيئًا مَّرِيئًا)

یا صلح کے معاوضہ میں چھوڑ دے (فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمْ فِي مَا اتَّخَذَتْ يَدُهَا)

(۴) وَإِنِّي لَأَعْلَمُ لَكُمْ خَيْرًا مِّنْ ذَلِكَ وَتِلْكَ آيَاتُ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِبُّونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنْ دِينِهِمْ سَبِيلًا مَّا يَدْعُونَ (النساء-۳)

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شریعت میں مہر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ لہذا

قانون کے ذریعہ سے اس کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔

(۵) أَلَمْ يَجْعَلْ لَكُمْ آيَاتٍ عَلَىٰ آيَاتِهِ لِيُذَكِّرَ الَّذِينَ لَمْ يَرْجِعُوا إِلَىٰ الذِّكْرِ (النساء-۶)

أَمْ وَاللَّهِ لَأَعْلَمُ لَكُمْ خَيْرًا مِّنْ ذَلِكَ وَتِلْكَ آيَاتُ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِبُّونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنْ دِينِهِمْ سَبِيلًا مَّا يَدْعُونَ (النساء-۶)

اس آیت کی رو سے نفقہ مرد پر عورت کا واجب حق ہے اور یہ ان حقوق زوجیت کا معاوضہ ہے جو رشتہ

نکاح سے مرد کو عورت پر حاصل ہوتے ہیں۔ عورت کا یہ حق کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ

وہ خود اس سے دست بردار ہو جائے، یا نشوز کی مرکب ہو۔

(۶) وَمَتَعَوْهُنَّ عَلَىٰ الْمَوْسِعِ قَدَرًا وَعَلَىٰ الْمُتَقَرِّدِ رُكُودًا (بقرہ-۲۱)

یہاں نفقہ کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی تعیین میں مرد کی استطاعت کا لحاظ کیا جائے گا۔

الدار مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور غریب مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق۔

(۷) وَاللَّيْلِ نَمَاحًا وَنَشُوزًا فَعِظُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاصْبِرْنَ يَوْمَهُنَّ فَإِنْ

أَطَعْتَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا (النساء-۶)

اس آیت کی رو سے مرد کو سزا دینے کا اختیار صرف اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ عورت نشوز اور

عدم اطاعت کی روش اختیار کرے۔ اور اس صورت میں بھی سزا کی صرف دو شکلیں مقرر کر دی گئی ہیں۔

ایک ہجر فی المضاجع یعنی ترک صحبت۔ دوسرے ضرب غیر مبرح یعنی ملکی مار جو صرف انتہار و وجہ کے

نشوز میں جائز ہے۔ اس حد سے تجاوز کرنا، یعنی بغیر نشوز کے سزا دینا، یا کم درجہ کے نشوز پر انتہائی سزا

دینا، یا انتہائی نشوونما پر مزید غیر مبرح کی حد سے گزر جانا ظلم میں داخل ہے۔

(۸) وَإِنْ خِفْتُمْ مِشْقَاقَ بَيْنِهِمَا قَابِلْتُ أَحْكَامَيْنِ أَحْيَاهُ وَحَكْمَاتِنِ أَهْلَاهُ إِنْ بَرَّيْتُمْ
إِصْلَاحًا يَوْفَى اللَّهُ بَيْنَهُمَا (النساء-۶)

اس آیت میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور خود آپس میں صلح کر لینے کی کوئی صورت نہ پیدا ہو تو ایک شخص مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک شخص عورت کے رشتہ داروں میں سے بطور حکم مقرر کیا جائے، اور دونوں حکم مل کر ان کے جھگڑے کا تصفیہ کریں۔
وَإِنْ خِفْتُمْ أَوْ قَابِلْتُ أَحْكَامَيْنِ مَنَاطِبِ الْمَسْلُومِينَ كَمَا أُولَى الْأَمْرِ فِيهَا، اس لئے حکم مقرر کرنا انہی کا کام ہے، اور اگر حکمین کوئی تصفیہ نہ کر سکیں تو آخر میں تصفیہ کا اختیار انہی کو حاصل ہے۔

(۹) فَإِنْ خِفْتُمْ أَوْ قَابِلْتُ أَحْكَامَيْنِ مَنَاطِبِ الْمَسْلُومِينَ كَمَا أُولَى الْأَمْرِ فِيهَا (بقرہ-۲۹)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زوجین کے معاملات میں فیصلہ کرتے وقت قاضی کو سب سے زیادہ جس امر کا لحاظ کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ آیا وہ دونوں اپنے ازدواجی تعلق میں حدود اللہ پر قائم رہ سکیں گے یا نہیں؟ اگر ظن غالب اس امر کا ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو پھر کوئی چیز اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کی خاطر زوجین کے درمیان جمع کا فیصلہ کرنا جائز ہو۔ سب سے اہم شے اللہ تعالیٰ کی حدود کا تحفظ ہے اور اس کے لئے اگر ضروری ہو تو ہر چیز قربان کر دی جاسکتی ہے۔ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخٰطِئُونَ (بقرہ-۲۹)

(۱۰) وَلَا تَمْسِكُوهُنَّ فِي الضَّرَبِ إِنْ تَعَدَّوْنَ (بقرہ-۲۹)

اس آیت میں قانون اسلامی کے ایک دوسرے اہم قاعدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مرد کے بند نکاح میں اس طرح نہ رد کی جائے کہ اس کے لئے موجب ضرر اور وجہ حق تلفی ہو۔ معاشرت ہو تو بالعودت ہو، و عَائِشَةُ وَهِيَ بِالْمَعْرُوفِ، اگر رد کا جائے تو معروف کے

ساتھ روکا جائے (فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ)۔ جہاں اس کی کوئی امید نہ ہو، اور اس کے برعکس ضرر اور حتیٰ تعنی کا خوف ہو، وہاں تسریح باحسان پر عمل کرنا ضروری ہے، کیونکہ حسبِ ارشادِ نبوی اسلام کے قانون میں نہ کوئی چیز ضرر پہنچانے والی ہے اور نہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے۔ کَلَّا ضَرَرَكَ اِضْرَارًا فِي الْاِسْلَامِ۔

(۱۱) فَلَا يَمِيلُوْا اَكْلَ الْمَيْلِ فَنَدَّ رُؤُهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (النساء: ۱۰)

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع کے لئے نازل ہوئی ہے مگر اس کے آخری ٹکڑے میں ایک عام قاعدہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ یہ کہ کسی عورت کو ایسی حالت میں نہ چھوڑا جائے کہ وہ ایک شخص کے رشتہ نکاح میں بندھ کر معلق ہو جائے، یعنی نہ تو اس کو شوہر کی محبت اور معاشرت ہی نصیب ہو اور نہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لینے کی آزادی حاصل ہو۔

(۱۲) الَّذِيْنَ يُوْتُوْنَ مِنْ نِّسَاءِهِمْ نَزْبِصًا اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ (بقرہ: ۲۸)

اس آیت میں عورتوں کی اوسط قوت برعاشق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی چار مہینہ تک وہ ضرر اور حدود اللہ سے تجاوز کے بغیر شوہر کی صحبت سے محروم رکھی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کسی ایک چیز کا خوف ہے۔ اس آیت کا بھی ایک خاص محل ہے، مگر یہ اپنے محل کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی رہنمائی کرتی ہے۔

(۱۳) وَالَّذِيْنَ يُوْمِنُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَاَلَهُمْ شُهَدَاؤُا اَلَا اَنْفُسُهُمْ (النور: ۱۰)

اس آیت میں لعان کا قانون بتایا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور گوہی نہ پیش کر سکے تو اس سے چار مرتبہ قسم لی جائے گی کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے، اور پانچویں بار یہ کہلوایا جائے گا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت۔ اس کے بعد عورت زنا کی سزا سے صرف اس طرح بچ سکتی ہے کہ وہ بھی چار مرتبہ یہ قسم کھائے کہ اس کے شوہر کا الزام

مجھٹا ہے اور پانچویں باریہ کہے کہ اگر اس کے شوہر کی بات سچی ہو تو اس پر خدا کا غضب نازل ہو۔ اس طرح جب ملاعت کی تکمیل ہو جائے تو زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے۔

(۱۳۱) اَلَا اِنَّ يَعْقُوْنَ اَوْ يَعْقُوْنَ الَّذِيْ يَبْدُوْا بِعُقْدَتِهَا اِنَّهَا حُرٌّ (فقہ - ۳۱)

اس آیت کے آخری فقرہ میں اس قاعدہ کی تصریح کی گئی ہے کہ عقد نکاح مروکے ہاتھ میں ہے، اور وہی اسے باندھنے اور کھولنے کا اختیار رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں طلاق کا ذکر آیا ہے، مذکورہ کے صیغوں میں آیا ہے، اور اس فعل کو مرد ہی کی طرف نسبت دی گئی ہے مثلاً اِنَّ عَزْمًا طَلَّقَ۔ اِنَّ طَلَّقَهَا اِذَا طَلَّقْتُمْ لِلنِّسَاءِ فَيَطْلُقُوْنَ رِيْعًا تَقِيْنًا۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ شوہر بحیثیت شوہر ہونے کے طلاق لینے یا نہ دینے کا کلی اختیار رکھتا ہے، اور کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جاسکتا جو اس کا یہ حق سلب کرتا ہو۔

لیکن اسلام میں تمام حقوق اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ ان کے استعمال میں ظلم اور حدود اللہ سے تجاوز نہ ہو۔ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (الطلاق - ۱) جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اس کا مستحق بناتا ہے کہ اس کا حق سلب کر لیا جائے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تَكْلُمُوْنَ (فقہ - ۲۸) نہ تم کسی کا نقصان کرو نہ تمہارا نقصان کیا جائے، یہ ایک عام قاعدہ ہے، جو اسلامی قانون کے ہر شعبہ میں اہم معاملہ میں جاری ہوتا ہے، اور مرد کا حق طلاق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پس جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے ظلم و ضرر کی شکایت ہو تو بقاعدہ اِنَّ يَطْلُقُ بِمَا يَشَاءُ فَيُطَلِّقُ فَيُطَلِّقُ اِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ اس کی شکایت اللہ اور رسول کے قانون پر پیش کی جائے گی اور اگر اس قانون کی نگاہ میں اس کی شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کو نافذ کرنے والوں، یعنی اولی الامر کو حق ہوگا کہ شوہر کو اس کے اختیار سے محروم کر کے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ اور تفریق اور تطلیق کے جو اختیارات شرع میں دیئے گئے ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ فقہاء کی ایک جماعت نے

بِیْدٍ ۛ عُقْدًا ۛ الْتِكَا حَرَسَ یَہ اسدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں، اور اس قاعدہ میں کوئی استثناء نہیں، اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حل میں قاضی کو یہ اقتدار نہیں کہ اس کے اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے۔ لیکن قرآن مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔

(۱۵) اَلطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَاِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيحًا بِاِحْسَابٍ - (۲-۲۹)

اس آیت میں طلاق کا نصاب بیان کیا گیا ہے اور یہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق رجعی ہے اور تیسری مرتبہ کی بائن۔

مسائل جزیئہ | ان اصولی احکام کو جن ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اب اسی ترتیب کے ساتھ ہم ان جزیئہ مسائل کو بیان کریں گے جو ان میں سے ایک ایک اصل کے تحت آتے ہیں۔ یہاں ہم تمام مسائل جزیئہ کا استقصاء کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان خاص مسائل کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن میں ضرورتاً و حالاً دانہ کے لحاظ سے ازسرنو احکام فقہی کی تفریح و توضیح ضروری ہے۔

ارتداد احد الزوجین | موجودہ زمانہ میں ارتداد کے مسئلہ نے خاص اہمیت اختیار کر لی ہے۔ جہاں تک مرد کے ارتداد کا تعلق ہے، اس میں کوئی پیچیدگی نہیں، کیونکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ لیکن عورت کے ارتداد کے مسئلہ میں پیچیدگی واقع ہوگئی ہے۔ بکثرت عورتیں صرف اس غرض کے لئے مرتد ہوگئی ہیں اور ہوسری ہیں کہ انہیں ایسے شوہروں سے رستگاری حاصل ہو جو ظالم ہیں یا انہیں ناپسند ہیں اس مسئلہ میں انگریزی عدالتیں اس ظاہر رویہ پر عمل کرتی ہیں جو ہاید و غیرہ میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، یعنی اگر تدا احد الزوجین وقعت الفرقہ بغیر طلاق رجعی زوجین میں کوئی مرتد ہو جائے تو فرقت بغیر طلاق واقع ہوتی ہے، لیکن علماء ہند اس قسم کے ارتداد کی رو کو روکنے کے لئے مشائخ پنج دستر قند اور بعض مشائخ بنار کے فتوے پر عمل کرنا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ

لے مرد یہ ہے کہ وہ عورت ہے مسلمان شوہر پر حرام ہو جاتی ہے مگر اس فرقت سے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے نکاح کرے۔

یہ ہے کہ ارتداد سے عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے نکاح میں بدستور رہتی ہے۔ اس فتعے کی بنا پر اس امر پر ہے کہ ایسی عورت چونکہ محض بند نکاح سے رہائی حاصل کرنے کے لئے مرتد بن جاتی ہے، اس لئے اس حیلہ کو روکنے کی یہی صورت ہے کہ نکاح پر اس کے ارتداد کا کوئی اثر تسلیم نہ کیا جائے۔ مگر اس فتعے کو قبول کرنے میں چند مشکلات ہیں جن پر شاید ان علماء کرام کی نظر ابھی تک نہیں پہنچی:-

اولاً، اسلام اور کفر کے معاملہ میں ملک کا قانون اور اسلامی شریعت دونوں صرف باقرار ساقی کا اعتبار کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ ایک عورت دل سے مرتد نہیں ہوئی بلکہ صرف اس نیت سے مرتد ہوئی ہے کہ اپنے شوہر سے جدا ہو جائے۔

ثانیاً، جو عورت کتابی مذاہب میں سے کسی مذہب میں چلی جائے اس کے حق میں تو بدرجہ آخر وَالْمُحْضَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ سے فائدہ اٹھا کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمان مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے، مگر جو عورت ہندو یا مجوسی ہو جائے یا کسی اور غیر کتابی مذہب میں چلی جائے، اس کو مسلمان مرد کے نکاح میں رکھنا تو قرآن مجید کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

ثالثاً، جو عورت اسلام کے دائرہ سے نکل کر دوسرے مذہب میں چلی گئی ہے، اس پر اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے؟ ہم ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہیں۔ اور اس حکومت کی نگاہ میں مسلمان، ہندو سکھ سب یکساں ہیں۔ ہم اس سے کس طرح یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی عورت کو جو مثلاً سکھوں یا آریوں کی جماعت میں شامل ہو چکی ہے اس کی مرضی کے خلاف اسی نکاح پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرے گی جو اس سے بحالت اسلام، اسلامی قانون کے ماتحت کیا گیا تھا؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک ارتداد کے مسئلہ میں مشائخ بلخ و عمرقند کے فتوے سے مسلمان علماء کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ درحقیقت دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عورتیں مزذکیوں ہوتی ہیں، ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے دو چار ہی فی صدی ایسی ہوں گی جن کے عقیدہ میں فی الواقع تغیر ہوتا ہے۔ درحقیقت

جو چیز ان کو ارتداد کی طرف لے جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ علم و ضرر کی بہت سی حالتوں میں راجح الوقت قانون کے تحت عورتوں کے لئے داد رسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ شوہر سخت سے سخت مظالم کرتا ہے مگر بیوی اس سے خلع حاصل نہیں کر سکتی۔ شوہر ناکارہ ہے، مجنون ہے، خطرناک یا قابل نفرت امراض میں یا سخت بیہودہ عادات میں مبتلا ہے، بیوی اس کے نام تک سے نفرت کرتی ہے، باہمی تعلقات منقطع ہیں، مگر بند نکاح سے آزادی کی کوئی سبیل نہیں۔ شوہر مفقود البحر ہے، سالہا سال سے اس کا پتہ نہیں، عورت پر زندگی اجیرن ہو گئی ہے، مگر اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی قسم کے حالات و حقیقت عورتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے دامن سے نکل کر کفر کے دامن میں پناہ لیں۔ اس کی روک تھام کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ ادھر ادھر سے فقہی جزئیات نکال کر ان قسمت کی ماری ہوئی عورتوں کے لئے کفر کے دامن میں بھی کوئی جائے پناہ نہ پہننے دی جائے، اور ان کو ارتداد کے بجائے خود کشی پر مجبور کیا جائے، بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہم خود اپنے قانون پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں اور ان اجتہادی احکام میں ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ترمیم و اصلاح کریں جن کی سختیوں کی وجہ سے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو اسلام کی آغوش سے نکل کر کفر کی گود میں جانا پڑتا ہے۔ جہاں تک اللہ اور رسول کے مخصوص احکام کا تعلق ہے ان میں قطعاً کوئی ایسی تنگی نہیں جو کسی کے لئے موجب ضرر ہی ہو سکا کہ جب ارتداد۔ یہ صفت صرف بعض اجتہادی احکام میں پائی جاتی ہے اور ان احکام کو بعض دوسرے اجتہادی احکام سے بدل کر ارتداد مسلمات کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کیا جاسکتا ہے۔

خیار بلوغ | قرآن مجید میں اگرچہ یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ عورت کے نکاح میں اس کے اولیاء کی رائے کا بھی دخل ہونا چاہئے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس قاعدہ کی جو تعبیر فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء کی رائے کا دخل ہونے کے معنی یہ نہیں کہ عورت اپنی زندگی کے اس اہم معاملہ میں بے اختیار ہے۔ بخلاف اس کے حضور نے ایجاباً عورت کو یہ حق دیا ہے کہ نکاح

کے معاملہ میں اس کی رضامندی حاصل کی جائے، چنانچہ ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں ابن عباس سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ میرے باپ نے میری مرضی کے خلاف میری شادی کر دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تجھ کو رد و قبول کا اختیار ہے۔ نسائی میں خنساء بنت خذام کی روایت ہے کہ ان کے باپ نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف کر دیا تھا جھوٹے ان کو بھی یہی اختیار دیا۔ وہ قطنی میں حضرت جابر کی روایت ہے کہ ایسے ہی ایک مقدمہ میں حضور نے محض اس بنا پر زوجین میں تفریق کرادی کہ نکاح لڑکی کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ نسائی میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے بھتیجے سے اس کا نکاح کر دیا ہے۔ حضور نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے قبول کرے چاہے رد کر دے اس پر اس نے عرض کیا:

یا رسول اللہ! اجرت ما صنع ابی واما
یا رسول اللہ میرے باپ نے جو کچھ کیا اسے میں
اس دت ان اکلکم النساء ان لیس الی
نے منظور کر لیا میرا مقصد تو صرف عورتوں کو بیتا تھا
الا باء من الاھرشیء۔
کہ ان کے باپ اس معاملہ میں مختار نہیں ہیں۔

مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور موطا میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہے:-

الا یمہ اھق بنفسھا من دلیھا والبکر
بن بیا ہی عورت اپنے دلی سے بڑھ کر اپنے نفس کے
تسأذن فی نفسھا۔
معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور باکرہ سے
اس کے نفس کے معاملہ میں اذن لیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا:

لا تنکم الایم حتی تستامرو ولا تنکم البکر
ٹوہریدہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس سے

۱۵ لغت میں ایم ہر اس عورت کو کہتے ہیں جو شوہر دلی نہ ہو، خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ۔

حقی تستاذن۔
 بجات نہ لے لی جائے۔ اور ماگرہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس کا اذن نہ لے لیا جائے۔

ولایت اجبار | یہ تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اصول شرع سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ نکاح کے لئے عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا باپ یا کوئی دلی کرے تو کیا کسی حال میں اس کا یہ حق کہ اس کے نفس کے معاملہ میں اس کی مرضی کا دخل ہو، ساقط ہو سکتا ہے؟ اس مسئلہ میں ہمارے فقہاء نے یہ فتوے دیے ہیں کہ اگر نابالغہ کا نکاح اس کے باپ یا دادا کے سوا کسی اور نے کیا ہو تو لڑکی کو حق ہوگا کہ بالغ ہونے پر اسے چاہے قبول کر لے، چاہے رد کر دے۔ لیکن اگر باپ یا دادا نے کیا ہو تو اسے یہ حق نہ ہوگا، اِلا یہ کہ باپ یا دادا کا سنی اختیار ہونا ثابت ہو جائے، مثلاً وہ فاسق ہو یا بے جیا ہو، یا اپنے معاملات میں سورتدبیر اور ناعاقبت اندیشی کے لئے مشہور ہو۔

یہ مسئلہ کہ باپ اور دادا کو نابالغہ پر ولایت اجبار حاصل ہے، اور ان کے کئے ہوئے نکاح میں لڑکی کو اختیار بلوغ استعمال کرنے کا حق نہیں ہے، قرآن مجید کی کسی آیت، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ محض فقہاء کے اس قیاس پر مبنی ہے کہ باپ اور دادا چونکہ لڑکی کے بدخواہ نہیں ہو سکتے اس لئے لڑکی کے لئے ان کا کیا ہوا نکاح لازم ہونا چاہئے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ فلاخيار لهما بعد بلوغهما لانهما كاملا الراى واخر الشفقة فيلزم العقد مباشرتهما كما اذا باشراه برضهما بعد بلوغ۔ لیکن یہ محض ایک قیاسی رائے ہے جو خدا و رسول کے احکام کی طرح نہ حکم ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ نقلاً و عقلاً اس پر متعدد حیثیات سے اعتراض وارد ہوتا ہے۔

اولاً، حدیث صحیح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی صاحبزادی کا نکاح کسی میں عمر بن ابی سلمہ سے کر دیا اور فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد اسے رد یا قبول کرنے کا اختیار ہے! اس حدیث سے نابالغہ کے لئے اختیار بلوغ مطلقاً ثابت ہوتا ہے، کیونکہ حضور نے ایسی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ میں چونکہ لڑکی

کا باپ نہیں بلکہ ابن عم ہوں اس لئے میرا کیا ہوا نکاح اس کے لئے لازم نہیں ہے۔

ثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ اگر لڑکی بالغ ہو تو باپ یا دادا کے مقابلہ میں اسے اپنی رائے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو لیکن وہی لڑکی اگر نابالغ ہو تو اس کا یہ حق کلیتاً سلب کر لیا جائے، حالانکہ معاملہ نکاح کے ساتھ عورت کے تعلق کی جس اہمیت کو ملحوظ رکھ کر شارع نے اس کو یہ حق دیا ہے وہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے۔ اگر کسی کے کامل الرائے اور وافر الشفقت ہونے کی بنا پر اس کو ولایت اجبار حاصل ہو سکتی ہے، تو وہ بلوغ کی حالت میں بھی اسی طرح حاصل ہونی چاہئے جس طرح عدم بلوغ کی حالت میں اس کے لئے ثابت کی جاتی ہے لیکن جب بالغ لڑکی پر کسی کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہے، تو نابالغ لڑکی پر کیوں حاصل ہو؟ ثالثاً، باپ دادا کا وافر الشفقت اور کامل الرائے ہونا کوئی یقینی اور ثابت شدہ امر نہیں ہے بعض کثرت کو دیکھ کر ایک قیاس قائم کیا گیا ہے۔ مگر اس قیاس کے خلاف بھی کثیر واقعات دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جاتے ہیں جن سے وافر شفقت کا ثبوت کم اور کمال رائے کا ثبوت کم تر ملتا ہے۔

رابعاً، اگر یہ قیاس صحیح بھی ہو تو اس کا بہت قوی امکان ہے کہ باپ دادا نیک نیتی کے ساتھ وافر شفقت اور کمال رائے رکھتے ہوئے ایک صغیر السن لڑکی کا نکاح ایک کم سن لڑکے سے کر دیں، اور لڑکا جوان ہو کر ان کی توقعات کے خلاف نالائق نکلے۔ خصوصاً موجودہ زمانہ میں جبکہ اسلامی تربیت کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے، تعلیم و تربیت کی خرابیوں سے نہایت بری سیرتیں پیدا ہو رہی ہیں، اور مسلمانوں کے گرد و پیش ایسا خراب ماحول پایا جاتا ہے جس کے بہت بُرے اثرات لڑکوں کے اخلاق و عادات پر ترتیب پورے ہیں، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم نہ قرار دیا جائے۔ کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتدا میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بد اخلاقیوں اور بری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور اس وقت باپ دادا کی ولایت اجبار خود ان کے لئے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔

خامساً، اگر باپ دادا سیٹی الاختیار ہوں تو ایک لڑکی کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں خیار بلوغ استعمال کر سکے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کو اپنے باپ یا دادا کے خلاف بدعتی ہستی و فجور، بے حیائی، سوء تدبیر یا حماقت و بلا دت کا ثبوت پیش کرنا ہوگا، اور یہ نہ صرف اس کے لئے مشکل ہے، بلکہ سخت معیوب بھی ہے۔

ان وجوہ سے فقہ کے اس جزئیہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، اور مصالِح کا اقتضایہ ہے کہ اس خالص اجتہادی مسئلے میں ترمیم کر کے صغیر و صغیرہ کو ہر حال میں خیار بلوغ دیا جائے۔

خیار بلوغ کی شرائط | اس سلسلہ میں فقہاء کا ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ بھی محل نظر ہے۔ باپ دادا کے سوا دوسرے اولیاء کے باب میں فتویٰ یہ ہے کہ اگر انہوں نے صغیرہ یا کرہ کا نکاح کر دیا ہو تو وہ خیار بلوغ استعمال کر سکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی بلا تاخیر وہ اپنی نارضا مندی کا اظہار کرے۔ اگر اس نے فوراً اس کا اعلان نہ کیا تو اس کا خیار باطل ہو جائے گا۔ یہ شرط صرف باکرہ کے لئے رکھی گئی ہے۔ ثیبہ اور نابالغ لڑکے کے لئے یہ حکم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جب تک وہ اپنی رضا کی تصریح نہ کریں، ان کو خیار فسخ حاصل ہے گا۔

یہ شرط جو صغیرہ نابالغہ کے لئے رکھی گئی ہے اس کا کوئی ثبوت ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں ملا۔ یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے۔ خیار فسخ کو بلوغ کے ساتھ شرط کرنے کی علت اس کے سوا کوئی نہیں کہ سن بلوغ کو پہنچ کر انسان میں بڑے اور بھلے کی تمیز پیدا ہوتی ہے، اور وہ عقل رسا سے کام لے کر اپنے معاملات میں ذمہ دارانہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی اس کے اندر کوئی بڑا انقلاب رونما ہو، اور آناً فاناً وہ ناقص الرائے سے کامل الرائے ہو جائے۔ اور بالفرض اگر ایسا ہوتا بھی ہو تو ثیبہ اور نابالغ لڑکے کا حال باکرہ کے حال سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ پس جب ان دونوں کے خیار بلوغ کو اس وقت

نکاح کے لئے تمتد کیا گیا ہے جب تک کہ وہ قولاً یا فعلاً اپنی رضامندی کی تصریح نہ کریں، تو کوئی وجہ نہیں کہ باکرہ کو بھی سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لئے کافی وقت نہ دیا جائے۔ ایک نا تجربہ کار دو شیرازہ بہ نسبت ایک ثیبہ اور ایک نوجوان مرد کے اس کی زیادہ مستحق ہے، کیونکہ وہ غریب نوزان دونوں سے زیادہ نا تجربہ کار ہوتی ہے۔

مہر کے مسئلہ میں یہ امر مسلم ہے کہ اللہ اور رسول کے قانون میں اس کے لئے کوئی آخری حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اس کے لئے چالیس اونسیہ کی انتہائی حد مقرر کرنی چاہی تھی، مگر ایک عورت نے ان کو ٹوک کر کہا کہ آیت **وَآتَيْنَهُمْ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ قِسْطًا** فَلَا تَأْخُذُ وَادُئُهُ مَثْمًا کی رو سے آپ کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں اس دلیل کو سن کر حضرت عمر نے فرمایا **امراؤة اصابت ورجل اخطاء**۔ پس جہاں تک مہر کی تحدید کا تعلق ہے قانون میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مہر کی زیادتی میں مبالغہ کرنا اور مرد کی قوت برداشت سے زیادہ مہر باندھنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے جسوز نے فرمایا:۔

الزمو والنساء الرجال ولا تغالوا فی المهر
عورتوں کو مردوں کے پتے باندھنے کی کوشش کرو
اور مہروں میں حد سے نہ بڑھو۔

ابو عمرو الاسلمی نے ایک عورت سے دو سو درہم مہر پر نکاح کیا تو آپ نے فرمایا **لو كنتم تغولون اللدا** من اودیتکم ما نزد تم را اگر تم کو ندی نالوں میں درہم بہتے ہوئے تھے تب بھی شاید تم اس سے زیادہ مہر نہ باندھتے)

حضرت انس نے ایک عورت سے چار اونسیہ (۱۶۰ درہم) پر نکاح کیا تو حضور نے فرمایا **کانما** تحتون الفضة من عرض هذا الجبل۔ (گویا کہ تم اس پہاڑ میں سے چاندی کھود کھود کر نکال رہے ہو) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ عورت کے مہر مقرر کرنے میں حد سے نہ بڑھو۔ اگر یہ دنیا میں

کوئی قابل عزت اور آخرت میں تقویٰ کی بات ہوتی تو تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار کرتے مگر آپ کی ازواج اور صاحبزادوں میں سے تو کسی کا مہر (۱۲) اوقیہ سے زیادہ نہ تھا۔ یہ تو محض زیادتی مہر کے متعلق ہے۔ لیکن ہمسے ملک میں جو رواج عام ہو گیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں روپیہ کی دستاویزیں مہر موبیل کے طور پر لکھدی جاتی ہیں۔ مگر نہ اتنی بڑی بڑی رقموں کا ادا کرنا ان کے لکھنے والوں کی قدرت میں ہوتا ہے، اور نہ لکھتے وقت وہ اس نیت سے لکھتے ہیں کہ کبھی ان کو مہر ادا کرنا ہے۔ یہ چیز کراہت کی حد سے گذر کر نکاح کے لئے موجب فساد ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمایا ہے کہ

من تزوج امرأة بصدق بنوی ان
لا یؤدیہ فہو نایب ومن ادا ان دینا
فیوی ان لا یقضیہ فہو سارق۔
جس نے ایک مال مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح
کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس مہر کو ادا نہ کرے گا
وہ دراصل زانی ہے، اور جس نے قرض لیا اور

نیت یہ رکھی کہ اس قرض کو ادا کرنا نہیں ہے وہ دراصل چور ہے۔

یہ اس قسم کے مہروں کی باطنی قباحت ہے۔ رہی ظاہری قباحت تو وہ بھی کچھ کم شدید نہیں۔ اس قسم کے مہر باندھنے کا حقیقی مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ شوہر طلاق نہ دے سکے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناموافق ہو جائے اور دونوں مل کر نہ رہ سکیں تو یہی زیادتی مہر عورت کے لئے بلائے جان ہو جاتی ہے۔ شوہر محض مہر کی نالاش کے خوف سے اس کو طلاق نہیں دیتا، اور سالہا سال بلکہ ساری عمر کے لئے غریب عورت محلق پڑی رہتی ہے۔ آج کل جن چیزوں نے عورتوں کو عام طور پر مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے ان میں سے ایک ہم چیز یہی مہر کی زیادتی ہے۔ اگر اس میں اعتدال برتا جائے تو قریب قریب ۵۰ فی صدی مشکلات رد نما ہونے سے پہلے ہی حل ہو جائیں۔

ہماری نزدیک اس کی اصلاح کے لئے اصول شرع کی خلاف ورزی سے بچتے ہوئے یہ صورت

اختیار کی جاسکتی ہے کہ ہر اگر مہر ہو تو فریقین میں کہ بلا کسی حد و انتہا کے بتنا چاہیں مقرر کر لیں۔ لیکن اگر وہ مہر ہو تو لازم قرار دیا جائے کہ اس کی دستاویز باقاعدہ اسٹامپ پر لکھی جائے اور نہ مہر پر پچاس فی صدی قیمت کا اسٹامپ لگایا جائے اسٹامپ کے بغیر یا ۵۰ فی صدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویز مہر قابل ادخال دعویٰ نہ ہو۔ اس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے تو مہر مہر کا یہ ستر یا بیس سے بھرا ہوا طریقہ باسانی مسدود ہو جائے گا۔ اُس وقت لوگ مجبور ہوں گے کہ اپنی استطاعت کے مطابق مہر مقرر کریں اور فضولیات میں روپیہ صرف کرنے کے بجائے نقد یا مال و جائداد کی صورت میں نکاح کے وقت ہی مہر ادا کر دیں۔

نفقہ اس باب میں نزاع کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر نفقہ دینے کی استطاعت رکھتا ہو مگر نہ دے اور دوسری شکل یہ کہ اس میں استطاعت ہی نہ ہو۔

پہلی صورت میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ قاضی اس کو نفقہ ادا کرنے پر ہر ممکن طریقہ سے مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ قاضی کے احکام کی تعمیل نہ کرے تو اس میں اختلاف ہے کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ عورت بطور خود اپنے نفقہ کا انتظام کرے خواہ شوہر کے نام پر قرض لے کر، خواہ محنت مزدوری کر کے، خواہ اپنے کسی عزیز سے مدد لے کر۔ بخلاف اس کے مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں قاضی کو بطور خود طلاق واقع کر دینے کا حق ہے۔ بعض علماء احناف نے مالکیہ کے اس فتوے کو اختیار کرنا پسند کیا ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ عورت خود نفقہ کا انتظام نہ کر سکتی ہو، یا اگر کر سکتی ہو تو شوہر سے علیحدہ رہنے میں اس کے معتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہو۔ لیکن یہ شرط کچھ درست نہیں معلوم ہوتی مگر آن مجید کی رو سے نفقہ عورت کا حق ہے جس کے معاوضہ میں اس پر شوہر کو حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص قصداً اس حق کو ادا کرنے سے انکار کر رہا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو زبردستی اس کے عقد نکاح میں بندھے رہنے پر مجبور کیا جائے جب

تک وہ کسی شخص کے نکاح میں ہے اس کی پردوش کا ذمہ دار اس کا شوہر ہے۔ ایسی حالت میں اس کو خورد و روزی کمانے یا اپنے رشتہ داروں پر بار ڈالنے یا ایک ظالم شوہر کے نام سے حصول قرض کی غیر ممکن الحصول پیشکش کرنے کی تکلیف میں ڈالنا خلافت عدل معلوم ہوتا ہے۔

دوسری صورت میں پھر حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ عورت کو صبر و احتساب کی تلقین کی جائے گی۔ اور اس سے کہا جائے گا کہ قرض لے کر یا کسی عزیز سے مدد لے کر گنہ کرے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی عورت کا نفع ہر شخص پر واجب ہے جس پر اس کی پردوش کا بار پڑتا اگر وہ بن بیاہی ہوتی۔ لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام احمد ابن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ اگر عورت ایسے شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکتی ہو اور تفریق کا دعویٰ کرے تو تفریق کرادی جائے گی۔ امام مالک کی رائے میں شوہر کو ہینہ دو ہینہ یا کسی مناسب مدت تک مہلت دی جائے گی۔ امام شافعی صرف تین دن کی مہلت دیتے ہیں، اور امام احمد حنبل کا فتویٰ یہ ہے کہ بلا تاخیر زوجین میں تفریق کرادی جائے۔

اس باب میں نہ صرف قرآن مجید کا وہ قاعدہ جو ولما انفقامن اموالہم میں بیان کیا گیا ہے، ائمہ ثلاثہ کی تائید کرتا ہے، بلکہ احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دارقطنی اور بیہقی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ منقول ہے کہ عدم نفقہ کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرادی جائے حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت ابو ہریرہ سے بھی یہی قول منقول ہے۔ تابعین میں سے سعید بن المسیب کا بھی یہی فتویٰ ہے، اور حضرت عمران عبدالعزیز نے بھی تحقیق کے بعد اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔ بخلاف اس کے حنفیہ کا استدلال اس آیت سے ہے کہ وَ مَن قَدِرَ عَلَیہِ رِزْقٌ فَلْیَنفِقْ مِمَّا آتَاہُ اللّٰهُ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اَلَا مَا اٰتٰہَا (الطلاق: ۱) لیکن اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نفقہ کے لئے شرعاً کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، بلکہ نفقہ دینے والے کی حیثیت پر انحصار ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں نفقہ سرے سے موجود ہی نہ ہو وہاں عورت کو بلا نفقہ گذر

کرنے کے لئے مجبور کیا جائے۔ بلاشبہ یہ عزیمت کا مقام ہے کہ ایک عورت مصیبت اور فاقہ کشی میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دے۔ اسلام ایسی ہی عزیمت کی تعلیم دیتا ہے، اور ایک شریعت قانون کو ایسا ہی ہونا چاہئے، لیکن اضافی تعلیم اور چیرہ ہے، اور شرعی حق دوسری چیز۔ نفقہ عورت کا شرعی حق ہے۔ اگر وہ برضا و رغبت اس کو چھوڑ دے اور اس کے بغیر ہی شوہر کی رفاقت کرنا پسند کرے تو نہایت قابل تعریف ہے۔ لیکن اگر وہ اس کو نہ چھوڑنا چاہے یا نہ چھوڑ سکے تو قانون اسلامی کے عدل و انصاف میں اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کو تکلیف اور جبر کے ساتھ عزیمت کے مقام بلند پر ٹھیرنے کی کوشش کی جائے۔

پس ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں تمام مذاہب میں سے احسن مذہب امام مالک کا ہے جو شوہر کو مناسب مدت تک مصیبت دینے کے بعد تفریق کا حکم دیتے ہیں۔

ستم ناروا | آئیر کریمہ واللہی تمخاؤن نشوؤنہن قَانِ اطْعَمْتُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ مَيْدَانًا

(النساء ۶) کی رو سے شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ بلا کسی جائز سبب کے اپنی بیوی پر کسی قسم کی سختی کرے خواہ وہ آزاد جسمانی ہو یا آزاد لسانی۔ اگر وہ ایسا کرے تو عورت کو قانون کی پناہ لینے کا حق ہے۔ اس باب میں کوئی تفصیلی حکم ہم کو نہیں مل سکا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قانون اسلامی کے اصول میں اس کی گنجائش ہے کہ قاضی کو ایسے مقابلہ سے عورت کی حفاظت، اور ناقابل برداشت صورتوں میں تفریق کا اختیار دیا جاسکتا ہے۔ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبقوں میں عورتوں کے ساتھ تالوا برتاؤ کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے، اور شوہریت کے معنی یہ سمجھے جا رہے ہیں کہ وہ ظلم و جور کا غیر محدود دلائس ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ قانون میں اس کے متعلق مناسب احکام کا اضافہ کیا جائے۔

تحکیم | اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو طریق کار اختیار فرمایا ہے وہ ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ کشف الغمہ میں ہے کہ آپ کے پاس ایک مرد اور اس کی بیوی کا مقدمہ آیا۔ آپ نے قرآن مجید

کے فرمان فَاَلْعَمُوْا حٰكَمًا مِّنْ اٰهْلِهَا كَمَا عَلَّمَكُمُوْا حٰكَمًا مِّنْ اٰهْلِهَا کے مطابق حکم دیا کہ دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک ایک حکم تجویز کریں۔ پھر دونوں حکموں کو مخاطب کہہ کے فرمایا: تمہارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کو ملا نامناسب سمجھو تو ملا دو، اور اگر تفریق کرنا مناسب سمجھو تو تفریق کر دو۔ پھر عورت سے دریافت فرمایا، کیا تو ان دونوں بچوں کے فیصلہ پر راضی ہے۔ اس نے عرض کیا ہاں میں راضی ہوں۔ اس کے بعد مرد سے یہی سوال کیا۔ اس نے کہا اگر وہ ملا دیں تو مجھے ان کا فیصلہ قبول ہے اور اگر تفریق کریں تو مجھے قبول نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: لیس ذلک لک، لست ببارحہ حتیٰ ترضیٰ بمثل ما رضیت بہ۔ ننھے اس کا حق نہیں، تو یہاں سے نہیں جاسکتا جب تک کہ اسی طرح تو بھی اپنی رضامندی کا اقرار نہ کرے جس طرح اس عورت نے کیا ہے۔“

میاں بھوی کے ایسے خانگی جھگڑوں میں جن کا تعلق بڑے اور اہم قانونی مسائل سے نہ ہو، تحکیم کے اس طریقے کو اختیار کرنا مناسب ہے، اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق قانون میں چند ایسی دفعات کا اضافہ کیا جائے جن میں تحکیم کے طریقہ، اور حکمین کے اختیارات اور ان کے متفقہ فیصلہ کے طریق نفاذ، اور اختلاف رائے کی صورت میں عدالت کے طریق کار کی صراحت کر دی جائے۔

عیوب میں خیار فسخ

عیوب زوجین کے مسئلہ میں فقہاء کے درمیان بکثرت اختلافات ہوئے ہیں ایک گروہ اس طعن گیا ہے کہ عورت اور مرد کے کسی عیب کی بنا پر دوسرے فریق کو خیار فسخ نہیں ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے وَلَا يَتَخَيَّرُ أَحَدُ الزَّوْجَيْنِ لِعَيْبِ الْآخَرِ وَلَا حَشَا كَجَنُونٍ وَجَذَامٍ وَبُصٍّ وَرَتْقٍ وَقَرْنٍ رِئِئِي مَيَاں اور میوی میں سے کسی کو بھی دوسرے کے کسی عیب پر فسخ نکاح کا اختیار نہیں، خواہ وہ عیب کیسا ہی سخت ہو، مثلاً جنون، جذام، برص، رتق اور قرن) صحابہ میں سے حضرت علی اور ابن مسعود اور ائمہ مجتہدین میں سے عطاء نخعی، عمر ابن عبدالعزیز، ابن ابی لیلیٰ، اوزاعی، ثوری، ابو حنیفہ اور ابو یوسف رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تمام ایسے عیوب جو مانع تعلقات زن و شوہر ہوں، ان میں عورت اور مرد دونوں کو خیار فسخ ہے، مثلاً جنون، جذام، برص، گندہ دہنی، امراض خبیثہ، اور ٹرمگاہ کے ایسے عوارض جو مانع قرابت ہوں۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے، چنانچہ ابن جزئی نے القوانین میں عیوب مذکورہ بالا کی تفصیل بیان کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ اِذَا كَانَ فِي أَحَدِ الزَّوْجَيْنِ أَحَدَ الْعُيُوبِ كَانَ لِلْآخَرِ الْخِيَارُ فِي الْبَقَاءِ مَعَهُ وَالْفِرَاقِ۔

امام شافعی کے نزدیک جنون، جذام اور برص میں عورت اور مرد دونوں کو خیار فسخ ہے۔ مگر قروح سیالہ فرج، مثلاً آتشک وغیرہ، اور گندہ دہنی اور خارشت میں خیار نہیں ہے۔ البتہ اگر عورت اندام نہانی کے ایسے امراض میں مبتلا ہو جو مانع مباشرت ہوں، یا مرد عینین یا

مقطوع الذکر ہو تو ایسی صورت میں فریق ثانی کو خیار فسخ ہے۔

امام محمد کے نزدیک شوہر کو عورت کے کسی عیب کی بنا پر خیار فسخ نہیں ہے۔ مگر عورت کو شوہر کے جنون اور ہذا م اور برص میں خیار فسخ ہے۔

ان تمام مذاہب میں سے دوسرا مذہب قرآن مجید کی تعلیم سے اقرب ہے۔ قرآن کی رو سے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں دو چیزوں کو مقصدی اہمیت حاصل ہے۔ ایک تحفظ اخلاق، دوسرے زوجهین کی باہمی مودت و رحمت۔ یہ دونوں مقصد ایسے عیوب میں فوت ہو جاتے ہیں جن سے زوجهین طبعاً ایک دوسرے سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں، یا ایک دوسرے کی طبعی خواہشات کو پورا نہ کر سکتے ہوں۔ پھر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ بات اسلامی قانون ازدواج کے اصول میں سے ہے کہ ازدواجی تعلق زوجهین کے لئے معنرت اور حدود اللہ سے تجاوز کا موجب نہ ہونا چاہئے۔ یہ قاعدہ بھی ان عیوب میں خیار فسخ نہ رکھنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ تمام امراض جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ضرر پہنچانے والے ہیں اور ان سے اس امر کا بھی خوف ہے کہ زوجهین میں سے کوئی ایک نفرت کی وجہ سے باہمی طبعی خواہشات پوری نہ ہونے کی وجہ سے حدود اللہ کو توڑ دے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان تمام عیوب میں زوجهین کے لئے خیار فسخ رکھا جائے۔

یہ تو اس صورت میں ہے جبکہ نکاح سے پہلے زوجهین کو ایک دوسرے کے حال کی خبر نہ ہو اور بعد میں علم ہوتے ہی اس پر نارضا مندی کا اظہار کر دیں۔ رہی یہ صورت کہ زوجهین کو نکاح سے پہلے ایک دوسرے کا حال معلوم تھا اور انہوں نے جان بوجھ کر نکاح کر لیا، یا ان کو معلوم تو نہ تھا مگر بعد میں علم ہونے پر انہوں نے خیار فسخ استعمال نہ کیا، یا نکاح کے بعد عیب پیدا ہوا، تو ان تمام صورتوں میں مرد کے پاس تو ایک چارہ کار ایسا موجود ہے جس سے وہ ہر وقت کام لے سکتا ہے یعنی طلاق۔ اور اس کے علاوہ دوسرا چارہ کار بھی اس کے پاس موجود ہے، یعنی دوسری شادی کر لینا۔ مگر

عورت کے لئے بعض صورتوں میں فقہاء نے کوئی چالاک کارِ شجوزہ نہیں کیا ہے اور بعض صورتوں میں کسی نے اس کی خلاصی کی تدبیر نکالی ہے اور کسی نے نہیں نکالی۔ اس باب میں جو فتاویٰ ہیں ان کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کر کے ان پر بحث کریں گے۔

عنین و محبوب وغیرہ | اگر شوہر محبوب (مقطوع الذکر) ہو تو اس بات پر قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عورت کو تفریق کا دعویٰ کرنے کا حق ہے، اور تحقیق حال کے بعد فی الفور تفریق کرائی جائے گی۔

اگر شوہر نامرد ہو اور عورت تفریق کا مطالبہ کرے، تو حضرت عمر کے فیصلہ کی بنا پر سے ایک سال تک علاج کی ہمت دی جائے گی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ قادر نہ ہو تو تفریق کرا دی جائے گی، لیکن اس کے ساتھ فقہاء نے حسب ذیل شرطیں لگائی ہیں:

۱۱، عورت کو پہلے سے اس کے عنین ہونے کا علم نہ ہو۔ اگر اس کو علم تھا اور اس نے برضا و رغبت اس سے نکاح کیا تو اسے تفریق کے مطالبہ کا حق نہیں:

۱۲، اگر عورت کو پہلے علم نہ تھا، مگر بعد میں علم ہونے کے بعد اس نے اس کے نکاح میں رہنے پر رضامندی کی تصریح کر دی تب بھی اس کو مطالبہ تفریق کا حق باقی نہیں رہا۔

۱۳، مرد ایک مرتبہ بھی مباشرت پر قادر نہ ہوا ہو۔ اگر اس نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو، تب بھی عورت تفریق کا حق نہیں رکھتی۔

ہم سے نزدیک یہ تینوں شرطیں درست نہیں ہیں۔ اگر کسی عورت نے قصداً اپنی حماقت سے کسی شخص کو عنین جانتے ہوئے اس سے نکاح کر لیا، تو اس کی یہ سزا معقول اور مناسب نہیں ہے کہ اس کو تمام عمر ایک نامرد شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے مفسد اس قدر بیش ہیں کہ بیان کی حاجت نہیں۔ ایسی نادان عورت کے لئے بس اسی قدر سزا کافی ہے کہ اس کو ہر سے محروم کر کے تفریق کرا دی جائے۔

اگر عورت کو نکاح کے بعد شوہر کے نام و ہونے کا علم ہوا اور اس نے ابتداءً اس کے ساتھ رہنے پر اپنی ضمانت کی تصریح کر دی تو یہ کوئی ایسا تصور نہیں جس کی بنا پر اس کو تمام عمر مصیبت کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔ ایک ناجزبہ کار و دشیزہ ابتدا میں ان فطری تکلیفوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو ایک عینین کی بیوی کو پیش آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نیک طبعی کی بنا پر یہ خیال کرے کہ شوہر اگر عینین ہے تو کیا ہے، میں اسی طرح اس کے ساتھ زندگی بسر کر لوں گی۔ مگر بعد میں اس کو وہ ناقابل برداشت تکلیفیں پیش آئیں جن کا اسے پہلے سے احساس نہ تھا، اور وہ اپنی صحت کی خرابی یا مبتلائے مصیبت ہونے کے خوف سے پریشان ہو کر تفریق کی خواہش کرے۔ کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہو گا کہ اس کی پہلی رضامندی کو سدا قرار دے کر اس کی زبان پکڑ لی جائے اور اس سے کہا جائے کہ تو نے ابتدا میں جو غلطی کی تھی اس کی یہی سزا ہے کہ اب تو سطر سطر کر مر جا، یا آبرو باختہ بن کر زندگی گزار، جہاں تک ہم غور کرتے ہیں، یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے، اور اس سے ایسے نقصانات پیدا ہونے کا امکان ہے جو اس عورت کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں گے بلکہ سوسائٹی میں پھیلیں گے اور نسلوں تک منتقل ہوں گے۔ اتنے بڑے نقصان کو گوارا کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ایک شخص کے نقصان کو گوارا کیا جائے درکن حالیکہ حقیقتہً تفریق میں اس کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی سزا اس غلطی کی اس عورت کو دی جاسکتی ہے تو وہ بس یہی ہے کہ اسے کل یا جزرہر سے محروم کر دیا جائے

قیمری شرط بھی ہمارے خیال میں بہت سخت ہے۔ نکاح سے شریعت کا جو مقصد ہے وہ اس قسم کے ازدواجی تعلق سے ہرگز پورا نہیں ہوتا۔ اسلام کا قانون کسی آسانی مخلوق کے لئے نہیں ہے، بلکہ عام انسانوں کے لئے ہے۔ اور عام انسانوں میں جو عورتیں پائی جاتی ہیں ان کے لئے اگر یہ ناممکن نہیں تو فاقیت درجہ دشوار ضرور ہے کہ ایک یا چند مرتبہ شوہر کی صحبت سے

متمتع ہو جانا ان کے لئے کافی ہو، اور اس کے بعد مدت العمر اس سے محروم رہ کر وہ ہنسی خوشی گزار دیں اور اپنی عصمت کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں۔ بالفرض اگر پچاس فی صدی عورتیں بھی اس پر قادر ہوں، تو ان بقیہ پچاس فی صدی عورتوں کا حشر کیا ہو گا جن کے ضبط و تحمل اور پاکیزگی اخلاق کا مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے؛ کیا ان کے مبتلائے معصیت ہونے اور سوسائٹی میں ان کی وجہ سے طرح طرح کے مفسد پھیلنے کی ذمہ داری اُس قانون پر نہ ہو گی جس نے ان کے لئے حلال کے دروازے بند کر کے انہیں حرام کے راستوں پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا؟ پس ہماری رائے میں عنت کی ہر شکایت پر خواہ وہ نکاح سے پہلے کی ہو یا بعد میں حادث ہوئی ہو، عورت کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہونا چاہئے، اور اگر کافی علاج کے بعد جس کے لئے ایک سال کی مدت مناسب ہے، یہ شکایت دور نہ ہو تو تفریق کرادی جانی چاہئے۔

فقہائے کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر ایک سال تک علاج کرانے کے بعد شوہر نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو، تو عورت کا حق تفریق ہمیشہ کے لئے باطل ہو جائے گا۔ یہاں پھر بجا شدت پائی جاتی ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس معاملہ میں ماہرین طب کی رائے پر اعتماد کیا جائے۔ اگر علاج کے بعد بھی ماہرین کی رائے یہ ہو کہ مرثیہ وظیفہ زوجیت ادا کرنے کے لئے پوری طرح اہل نہیں ہو سکا ہے تو تفریق کرادی جانی چاہئے۔

فقہائے خصی کے لئے وہی قانون رکھا ہے جو عنین کے لئے رکھا گیا ہے، یعنی اس کو بھی علاج کے لئے ایک سال کی مدت دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے مباشرت پر قادر ہونے کی امید کی جاسکتی ہے (کشافی الہدایہ)۔ لیکن طبی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس معاملہ میں خصی اور بیجوب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ مرد خواہ مقطوع الذکر ہو یا مقطوع الانیشین، دونوں صورتوں میں وظیفہ زوجیت کے لئے وہ یکساں نا اہل ہوتا ہے

اور کوئی علاج اس کی کھوئی ہوئی اہلیت کو واپس نہیں لاسکتا۔ لہذا خصی اور محبوب کے حق میں ایک ہی قانون ہونا چاہئے۔

جنون | مجنون کے بارے میں حضرت عمر کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے علاج کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی جائے، اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو اس کی عورت اس سے جدا کر دی جائے۔ فقہاء نے اسی فیصلہ کو لیا ہے، اور مختلف طریقوں سے جزئیات میں اس حکم کو جاری کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم صرف اس مجنون کے لئے ہے جو نکاح سے قبل مجنون تھا اور نکاح کے بعد مہبتری پر قادر نہ ہوا اس لحاظ سے گویا وہ عین ہے اور اسی لئے اس کو ایک سال کی مہبت دی جاتی ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ کی رائے میں جنون اگر حادث ہو تو اس کو علاج کے لئے ایک سال کی مہبت دی جائے گی۔ اور اگر مطبق ہو تو وہ محبوب کے حکم میں ہے، بلا تاخیر تفریق کرادی جائے گی۔ امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک حادث اور مطبق دونوں میں ایک سال کی مہبت بغرض علاج دی جائے گی، اور اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو تفریق کرادی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ فقہائے مالکیہ حسب ذیل شرطیں لگاتے ہیں:-

(۱) اگر نکاح سے پہلے وہ مجنون تھا اور عورت نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا تو وہ تفریق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

(۲) اگر نکاح کے بعد اسے معلوم ہو کہ وہ مجنون ہے اور اس نے بصراحت اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی تب بھی تفریق کا حق باقی نہ رہا۔

(۳) اگر جنون نکاح کے بعد پیدا ہو تو عورت صرف اس صورت میں تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے کہ جنون پیدا ہونے کے بعد اس نے اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی کی تصریح نہ کی ہو اور اپنے اختیار و رضامندی سے اس کو مباشرت یا دواعی مباشرت کا موقع نہ دیا ہو۔

یہ شرطیں اسی نوعیت کی ہیں جن کا ذکر عین کے باب میں گذر چکا ہے اور ان پر بھی ہم کو وہی اعتراض ہے رشرلیت تمدن اور اخلاق کے مقاصد ایسی صورت میں کبھی پورے نہیں ہو سکتے کہ کسی عورت کو ایک پاگل شخص کے ساتھ زبردستی باندھ رکھا جائے۔ اگر اس نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا تو اس کے لئے یہ سزا کافی ہے کہ اس کو بہر سے محروم کر دیا جائے۔ اگر نکاح ہو جانے کے بعد اسے جنون کا علم ہو اور اس نے ابتداءً اس پاگل کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کر دیا، لیکن بعد میں اس کے لئے روحانی و جسمانی تکلیفیں ناقابل برداشت ہو گئیں تو حقیقت اس نے کوئی ایسا بزم ہی نہیں کیا جس کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ تمام عمر وہ ایک پاگل کے ساتھ رہے، تکلیف اور خطرات سے بھری ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور کی جائے۔ اگر نکاح کے بعد جنون پیدا ہوا اور ابتدائی حالت جنون میں عورت نے وفاداری اور رفاقت کے شریکانہ جذبات کی بنا پر اس کو چھوڑنا پسند نہ کیا اور حتی الامکان اس کی خدمت کی، اور سابق کا سابق دن و شوہر اس کے ساتھ رکھنا گوارا کر لیا تو اس سے یہ کیوں لازم آجائے کہ جب اس کا پاگل پن اس بیچاری کے لئے ناقابل برداشت ہو چکا ہو اس وقت بھی اس کو رہائی دلانے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ قید لگانے سے قانون کا منشا یہ ہے کہ جوں ہی کسی عورت کے شوہر میں آثار جنون ہوید اہوں، وہ فوراً اس کی تمام کھلی محبتیں اور رفاقتیں فراموش کر کے اس کے ساتھ بے دفاعی اختیار کر لے اور اس کو چھوڑ کر چلی جائے، اس خوف سے کہ اگر بعد میں اس جنون نے مستقل ناقابل برداشت صورت اختیار کر لی تو اس وقت کی وفاداری و رفاقت بلائے جان ثابت ہوگی اور اس کا بہت بُرا خمیازہ بھگتنا پڑے گا؟

اس قسم کی شرطیں عائد کرنے میں عورتوں کے ساتھ بہت سختی کی گئی ہے۔ عورت اگر بیکار ہو جائے یا جنون میں مبتلا ہو، یا کسی نفرت انگیز یا مضرت رساں مرض میں مبتلا ہو تو مرد اسے

طلاق دے سکتا ہے۔ یا دوسری شادی کر کے اپنی زندگی خوشگوار طریقہ سے بسر کر سکتا ہے۔ لیکن مردان حالات میں کسی حالت میں مبتلا ہو تو عورت نہ تو اسے طلاق دے سکتی ہے، نہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کر سکتی ہے۔ اس کے لئے بجز تفریق کے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اب اگر اس ایک چارہ کار پر بھی ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے اکثر و بیشتر حالات میں اس کے لئے مفصلی کی کوئی صورت باقی ہی نہ رہے تو یہ اُس عدل اور توازن کے غلات ہو گا جو اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ہے۔ ایسے تمام معاملات میں قرآن مجید کی وہ آیات ہمارے لئے دلیل راہ ہونی چاہئیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ نکاح میں معاشرت بالمعروف ہونی چاہئے، عورت کو مرد کے نکاح میں رکھا جائے تو اس طرح کہ اس میں ضرر اور تعدی نہ ہو، اور حدود اللہ ٹوٹنے کا خوف نہ ہو۔ اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ لازمی شرطیں پوری نہ ہوں تو تسریح باحسان کے قاعدہ پر عمل ہونا چاہئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک پاگل، یا آتشک زندہ، یا جذامی، یا مبروص شوہر کے ساتھ بجز واکراہ بند ہے رہنے سے بڑھ کر کسی عورت کے لئے ضرر اور تعدی کی کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے؟ اور کون نہیں سمجھ سکتا کہ جو عورت اس حالت میں بجز رکھی گئی ہو اس کے لئے حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے کس قدر مواقع زندگی میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور ان مواقع سے بچنا ایک اوسط درجہ کی عورت کے لئے کس قدر دشوار ہے؟

مفقود الخبر | مفقود الخبر کے متعلق قرآن مجید میں کوئی صریح حکم نہیں ہے۔ احادیث میں بھی کوئی معتبر حکم نہیں۔ دارقطنی نے اپنی سنن میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :-

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امرأة
المفقود امرأة حشي ياتها اليبان۔
حضور نے فرمایا کہ مفقود کی بیوی اسی کی بیوی ہے
جب تک اس کا حال معلوم نہ ہو جائے۔

لیکن، حدیث سوار بن مصعب اور محمد بن شریبیل ہمدانی کے واسطے سے پہنچی ہے جو

مجموع میں۔ ابن شریک کے متعلق ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ انہ یروی عن المغیرۃ منا کیرا باللیل۔ اور سوہبن مصعب کے متعلق ابن القطان نے لکھا ہے کہ وہ متروکین میں ابن شریک سے زیادہ مشہور ہے۔ پس یہ حدیث ضعیف ناقابل احتجاج ہے۔ علاوہ میں مفقود کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے اکابر صحابہ کی آراء میں جو اختلاف ہوا ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان حضرات میں سے کسی کو اس حدیث کا علم نہ تھا، اور نہ ان کے عہد میں کسی صحابی کو اس کی خبر تھی، کیونکہ اگر صحابہ میں سے کوئی بھی اس حدیث سے واقف ہوتا تو وہ ان حضرات کے سامنے اسے پیش کر کے اختلاف کو ختم کر دیتا۔ محمد بن شریک اس حدیث کو مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد کی نہایت نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور گورنری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث معلوم ہوتی اور وہ حضرت عمرؓ و عثمانؓ رضی اللہ عنہما کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے دیتے۔ ان وجوہ سے یہ سمجھنا چاہئے کہ مفقود کے بارے میں کوئی حکم منصوص نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق کلیتہً اہل علم کے اجتہاد سے ہے۔

صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کی آراء اس مسئلہ میں مختلف ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہ ہے کہ مفقود کی بیوی کو چار سال تک انتظار کا حکم دیا جائے۔ یہی رائے سعید بن المسیب، زہری، نخعی، عطاء، کسول، اور شعبی کی ہے۔ امام مالک نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور امام احمد کا میلان بھی اسی کی طرف ہے۔

دوسری جانب حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ میں جن کی رائے یہ ہے کہ مفقود الحجر کی بیوی کو اس وقت تک صبر کرنا چاہئے جب تک کہ وہ واپس نہ آئے یا اس کی موت کی تحقیق نہ ہو جائے۔

سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے۔ انتظار کے لئے حنفیہ یہ قاعدہ تجویز کرتے ہیں کہ جب تک شخص مفقود کے ہم عمر لوگ اس کی بستی یا اس کے ملک میں زندہ ہوں اس وقت تک اس کی بیوی انتظار کرے۔ بعض بزرگوں نے انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر کا اعتبار کیا ہے۔ یعنی ایک نسان زیادہ سے زیادہ جس عمر تک پہنچ سکتا ہے اس عمر تک مفقود کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے مثلاً اگر کوئی شخص ۲۰ سال کی عمر میں مفقود ہوا ہو تو اس کی بیوی کو بقول بعض ۹۰ سال اور بقول بعض ۷۰ سال اور بقول بعض ۵۰ سال یا کم سے کم ۴۰ سال انتظار کرنا پڑے گا، کیونکہ بعض کے نزدیک انسان کی عمر طبعی ۱۲۰ سال ہے اور بعض ۱۰۰ یا ۹۰ یا ۸۰ یا ۷۰ قرار دیتے ہیں۔

اس مسئلہ میں حیب ہم قرآن مجید کے اصولی احکام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو حضرت عمر اور ان کے متبعین کا مذہب ہم کو صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہی اسلامی قانون کی روح اور اس کے عدل اور اس کے توازن اور اس کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔ قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ چار بیویوں کی اجازت دینے کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے کہ **فَلَا تَمْلِكُوا كَلَّ الْمَيْلِ تَشَدُّ رُؤُهَا كَالْعَلَقَةِ**۔ ایک بیوی کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی کو معلق چھوڑ دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کسی عورت کو معلق چھوڑ دینا پسند نہیں کرتا۔ اور جب وہ شوہر کی موجودگی میں اس کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے مفقود ہونے کی صورت میں کیونکر پسند کر سکتا ہے۔ دوسری جگہ شوہروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر تم اپنی بیویوں سے ایلا کر دو تو زیادہ سے زیادہ چار مہینے تک ایسا کر سکتے ہو اس کے بعد تم کو طلاق دینا ہو گا یہاں پھر اسلامی قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی صحبت سے اتنی مدت تک محروم نہ رکھی جائے کہ اس کے لئے موجب ضرر ہو یا حدود اللہ سے تجاوز کا سبب

من جائے۔ پھر دَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ بِخَيْرٍ اِنَّا فرمایا گیا جس کا منشاء صاف طور پر یہ ہے کہ رشتہ ازدواج میں ضرر نہ ہونا چاہئے، اور یہ ظاہر ہے کہ مفقود الخیر کی بیوی کو مدت العرا انتظار کا حکم دینے میں انتہا درجہ کا ضرر ہے۔ اس کے ساتھ وہ آیت بھی قابل غور ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو تو خلع میں کچھ مضائقہ نہیں یہاں حدود اللہ کی حفاظت کو رشتہ ازدواج کے قیام پر مقدم رکھا گیا ہے، اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جس عورت کا شوہر مدخل سے مفقود ہو اس کے لئے حدود اللہ پر قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ ان تمام احکام کے اصول اور ان کے مصالح اور ان کی حکمت پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ مفقود الخیر کی بیوی کو ایک غیر معلوم مدت تک انتظار کا حکم دینا اور اس کو معنی رکھ چھوڑنا درست نہیں ہے۔

مذہب مالکی کے احکام | علماء احناف نے انہی وجوہ سے مفقود الخیر کے مسئلہ میں مذہب مالکی کے حکم کے مطابق فتویٰ دینا پسند کیا ہے۔ لہذا اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں مالکیہ کے تفصیلی احکام کیا ہیں۔

مذہب مالکی کے لحاظ سے فقدان زوج کی تین صورتیں ہیں، اور ہر ایک کے احکام جدا جدا ہیں:-

(۱) مفقود نے اپنے پیچھے اتنا مال نہ چھوڑا ہو کہ اس کی بیوی گذر بسر کر سکے۔ اس صورت میں حاکم اس کو انتظار کا حکم نہیں دے گا۔ بلکہ تحقیق حال کے بعد بلا انتظار اس کو باختیار خود طلاق دے گا یا اسے اجازت دے گا کہ اپنے اوپر آپ طلاق وارد کرے۔ شافعی اور حنبلی مذہب

سے تطلیق کے لئے حاکم کے بطور خود طلاق دینے سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ عورت کو خود اپنے اوپر طلاق واہد کرنے کی اجازت دے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے فرمایا تھا کہ انت املک بنفسک من مشئت اوقت مع زوجک وان مشئت فارقتہ (یعنی تجھے اپنے نفس کا اقتدار ہے خواہ اپنے شوہر کے ساتھ ہے یا اس جدا ہو جائے)

بھی اس مسئلہ میں مالکی مذہب کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک عدم نفقہ بجائے خود تفریق کے لئے کافی وجہ ہے۔

(۲) مفقود نے مال تو چھوڑا ہے، مگر عورت جو ان ہے اور اُس کو کسی طویل مدت کے لئے معلق رکھ چھوڑنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہے۔ ایسی صورت میں حاکم اس کو ایک سال یا چھ مہینے یا جس قدر مدت مناسب سمجھے انتظار کرنے کا حکم دے گا۔ اس باب میں حنبلی مذہب بھی مالکی مذہب کا ہم نوا ہے۔ بلکہ بعض شدید صورتوں میں حنابلہ اور مالکیہ نے بلا انتظار بھی تفریق کو جائز رکھا ہے۔ نیز خوف معصیت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مدعیہ خود منہ چھوڑ کر کہدے کہ مجھے اس شوہر کی قید نکاح سے آزاد کر دو ورنہ میں زنا کروں گی۔ بلکہ یہ دیکھنا خود قاضی کا کام ہے کہ جو عورت نقد ان زوج کی شکایت لے کر آئی ہے اُس کی عمر کیا ہے، کس ماحول میں رہتی ہے، اور دعویٰ کرنے سے پہلے کس قدر مدت شوہر کے انتظار میں گزار چکی ہے، ان چیزوں پر نظر کرنے سے وہ خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس کے اخلاق کی حفاظت کے لئے اُسے مدت انتظار میں کس قدر تخفیف کرنی چاہئے۔

(۳) مفقود نفقہ بھی چھوڑ گیا ہے اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا خوف بھی نہیں ہے اس صورت میں پھر چار شقیں پیدا ہوتی ہیں۔

الف۔ اگر مفقود بلاد اسلام میں یا ایسے ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے ہند ب دنیا کے تعلقات ہیں اور جہاں اس کا پتہ چلانا ممکن ہے، تو اس کی عورت کو چار سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

ب۔ اگر وہ میدان جنگ میں کھویا گیا ہے تو اس کی تلاش کی امکانی کوشش کرنے کے بعد ایک سال انتظار کیا جائے گا۔

ج۔ اگر وہ کسی اندرونی نساد کے سلسلہ میں کھویا گیا ہے تو فنا و ختم ہونے کے بعد اُس کی تلاش کے لئے امرکافی کوشش کی جائے گی پھر بلا انتظار اس کی بیوی کو عدت و وفات گزرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔

ح۔ اگر وہ ایسے وحشی ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات نہیں ہیں، اور جہاں اس کے تلاش کرنے کا امکان نہیں ہے، تو اس کی بیوی کو مدت تعمیر گزارنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مدت تعمیر کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض ۷۰ سال کہتے ہیں، بعض ۵۰ سال اور بعض ۷۵ سال۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ وہ کافی نفعہ چھوڑ گیا ہو، اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا بھی خوف نہ ہو۔

علماء احناف عموماً اپنے فتاویٰ میں مذہب مالکی کی ان شرائط کو نظر انداز کرتے ہیں اور فقہان زوج کی تمام صورتوں میں چار سال کی مدت انتظار کا فتویٰ دیتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ خصوصاً موجودہ زمانہ میں جب کہ اخلاقی حالات کو بگاڑنے کے بکثرت اسباب پیدا ہو گئے ہیں ہر فاقہ ازدوج عورت کے لئے چار سال کی مدت انتظار پر اصرار کرنا مصالح شرعیہ کے بالکل خلاف ہے۔ آج اسلامی سوسائٹی میں وہ زبردست اخلاقی ڈسپلن باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں تھا، غیر اسلامی قوانین کے رواج نے ان تمام بندشوں سے انسان کو آزاد کر دیا ہے جو شہوات نفس کو قابو میں رکھنے کے لئے اسلام نے قائم کی تھیں۔ یسینا، عریاں تعادیر عشقیہ ناولوں اور قصوں کے رواج عام اور عورتوں اور مردوں کے آزادانہ میل جول نے جذبات کو متحرک کرنے کے اتنے سامان پیدا کر دیئے ہیں کہ کسی شخص کے لئے ضبط نفس اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں یہ کہاں تک مناسب ہوگا کہ ایک جوان عورت جب اپنے مفقود النحر شوہر کی واپسی کا دو تین سال انتظار کرنے کے بعد عاجز آ کر عدالت

میں رجوع کسے تو عدالت اس کو مزید چار سال انتظار کرنے کا حکم دے۔ یہ ایسی سختی ہے جس میں صرف عورتوں ہی کے لئے ضرر نہیں ہے، بلکہ اس کے مضر نتائج تمام قوم میں پھیل جانے کا خوف ہے۔ لہذا ہماری تجویز یہ ہے کہ قانون میں مفقود النحر کے متعلق مذہب مالکی کی تمام شرائط کو شامل کیا جائے اور اجراء احکام میں فاقدا الزوج عورت کی عمر اس کے ماحول اور اس مدت کا مناسب لحاظ کیا جائے جس کو عدالت انتظار میں گزارنے کے بعد اس نے عدالت کی طرف رجوع کیا ہو۔

حکم بصورت واپسی مفقود | اس سلسلہ میں یہ سوال بھی بحث طلب ہے کہ اگر شوہر مفقود، مدت انتظار کے ختم ہونے کے بعد واپس آئے تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عمر کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کے نکاح ثانی سے پہلے اس کا شوہر واپس آگیا تو وہ اسی کو طے لگی، لیکن اگر عورت نکاح کر چکی ہے تو خواہ شوہر ثانی کے ساتھ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں شوہر اول کا اس پر کوئی حق نہ رہا۔ امام مالک نے موطا میں حضرت عمر کے اس قول سے استناد کیا ہے اور یہی مذہب مالکی کا منقہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت ہر حال میں پہلے شوہر کو واپس لے گی خواہ دوسرے شوہر سے خلوت ہو چکی ہو اور بچے تک پیدا ہو گئے ہوں۔ مزید برآں خلوت ہو چکنے کی صورت میں دوسرے شوہر سے اس عورت کو ہر بھی دلایا جائے گا۔ حنفیہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے بھی آخر میں حضرت علی کے اس فیصلہ کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ لیکن امام مالک کے نزدیک حضرت عمر کا رجوع ثابت نہیں ہے (ملاحظہ ہو موطا باب عدالتی تفقدتہ وجہا۔ اور المغنی لابن قدامہ)۔

حضرت عثمان کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت نکاح ثانی کر چکی ہو، پھر شوہر اول واپس آ جائے تو اس سے دریافت کیا جائے گا کہ تجھے بیوی چاہئے یا نہ؟ اگر اس نے ہر واپس لینے یا معاہدہ لینے)

کو پسند کیا تو عورت شوہر ثانی کے پاس چھوڑ دی جائے گی۔ اور اگر وہ بیوی کو واپس لینے پر اصرار کرے تو عورت کو اپنے دوسرے شوہر سے جدا ہو کر عدت طلاق گزارنی ہوگی پھر وہ پہلے شوہر کے حوالہ کر دی جائے گی اور دوسرے شوہر سے اس کو نہر دلایا جائے گا۔ بعض روایات میں حضرت عمرؓ سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے لیکن امام مالک کے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک ان تینوں فیصلوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ احسن ہے، اس لئے کہ اگر نکاح ثانی ہو جانے کے بعد بھی شوہر اول کا حق عورت پر قائم ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کوئی شخص ایسی عورت سے نکاح کرنا پسند نہ کرے گا جس کے متعلق اس کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ نہ معلوم کب اس کا پہلا شوہر واپس آجائے، اور نہ صرف عورت اس سے چھین جائے، بلکہ اس کو نہ بھی دینا پڑے، اور بچے ہو جانے کی صورت میں اس کی اولاد الگ براب ہو۔ اس قسم کی شرط عائد کرنے میں عورت کے لئے غایت درجہ کا ضرر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک طویل اور تھکائینے والی مدت انتظار گزار کر بھی اس کی مصیبت ختم نہ ہو، عدالت سے آزادی کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے پاؤں میں ایک زنجیر پڑی ہے اور اس کو ساری عمر متعلق حالت ہی میں رہ کر گزارنی پڑے۔

لعان | لعان کے متعلق قرآن مجید کا حکم پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہاں اس کے تفصیلی احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

شوہر خواہ اپنی بیوی پر بالفاظ صریح زنا کا الزام لگائے یا اولاد کے متعلق کہے کہ وہ اس کی نہیں ہے، دونوں صورتوں میں لعان واجب آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے فریقین کو مخاطب کر کے تین مرتبہ فرمایا: اللہما اعلم ان احدكما کاذب فصل منكما من تائب اللہ خوب جانتا ہے کہ تم دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے، پھر کیا تم میں سے

کوئی توبہ کرے گا؟" حسبِ دونوں نے توبہ سے اعراض کیا تو آپ نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق پہلے شوہر سے چار قسمیں اس بات پر لیں کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے یہ کہلوایا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ پھر اسی طرح چار قسمیں عورت سے لیں کہ جو الزام اس پر لگایا گیا ہے وہ غلط ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے کہلوایا کہ اگر یہ الزام صحیح ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ اس کے بعد حضور نے فرمایا: **ذَا كَمُ التَّفْرِيقِ بَيْنَ كُلِّ مَتَلَا عَنِينِ اِنَّي يُؤْمِرُ الْعَيْشَةَ اِذَا تَفَرَّقَا لَا يَجْتَمِعَانِ اَبَدًا**۔ یہ ہر لعان کرنے والے زوجین کے درمیان قیامت تک کے لئے تفریق ہے، اس تفریق کے بعد وہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے؛ شوہر نے عرض کیا کہ جو مال میں نے اس کو بہر میں دیا تھا وہ واپس دلویا جائے۔ آپ نے جواب دیا: **اَلَا مَالُكَ - بِن كُنْتَ صَدَقْتَ عَلَيْهِا فَبِمِ اسْتَعَلَّتْ مِنْ فَرْحِهَا وَاِنْ كُنْتَ كَذَبْتَ عَلَيْهِا فَاِنَّ لَكَ اَلْبَدَلَ** منہا مال تجھے نہیں مل سکتا۔ اگر تو نے سچا الزام لگایا ہے تو یہ مال اس تم سے کامعاوضہ ہے جو تو اس سے اٹھا چکا ہے سادہ اگر تو نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی ہے تو مال کی واپسی کا استحقاق تجھ سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا۔

حضور کے اس فیصلہ سے حسبِ ذیل احکام نکلتے ہیں:-

۱۱۔ لعان قاضی کے سامنے ہونا چاہئے، عورت اور مرد آپس میں یا اپنے رشتہ داروں کے سامنے لعان نہیں کر سکتے۔ نہ ایسے لعان سے تفریق ہو سکتی ہے۔

۱۲۔ لعان سے پہلے قاضی عورت اور مرد دونوں کو موقع دے گا کہ ان میں سے کوئی ایک قصور

کا اعتراف کرے۔ جب دونوں اپنی اپنی بات پر اصرار کریں تب لعان کرایا جائے گا۔

۱۳۔ فریقین کی طرف سے لعان کا فعل تمام ہونے کے بعد قاضی یا لعان کرے گا کہ ان کے درمیان

تفریق کر دی گئی۔ جہور کا خیال ہے کہ لعان سے خود بخود فرقت واقع ہو جاتی ہے لیکن امام ابوحنیفہ کی

رائے یہ ہے کہ تفریق کے لئے حکم حاکم ضروری ہے تمام معتبر احادیث جو اس مسئلہ میں ہم کو پہنچی ہیں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ہر ایسے مقدمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعان کا فعل پورا ہونے کے بعد تفریق کا فیصلہ صادر فرمایا ہے، اور محض طاعت کو فرقت کے لئے کافی قرار نہیں دیا ہے۔

۱۴) لعان سے جو تفریق کی جاتی ہے وہ ابدی ہے۔ اس کے بعد فریقین اگر دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ اس معاملہ میں تحلیل کا وہ قانون جاری نہیں ہوتا جو حَتَّى تَبْتَغُوا ذُجَّاجًا غَيْرَکُمْ میں بیان کیا گیا ہے۔

۱۵) لعان سے مہر ساقط نہیں ہوتا۔ خواہ شوہر کا الزام حقیقت میں صحیح ہو یا غلط، پھر صورت مہر اس کو دینا پڑے گا۔ یا اگر بے چکا ہے تو اس کو واپس مانگنے کا حق نہیں ہے۔

اگر عورت پر الزام لگانے کے بعد شوہر لعان کرنے سے انکار کرے تو جہور کی رائے میں اس پر حدِ قذف جاری کی جائے گی، اور امام ابوحنیفہ کی رائے میں وہ حد کا نہیں بلکہ قید کا سزاوار ہوگا۔ اسی طرح اگر شوہر کے لعان کر چکنے کے بعد عورت لعان سے انکار کرے تو شافعی مالک اور احمد رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ اس کو جرم کیا جائے گا، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس کو قید کیا جائے گا۔ اس باب میں امام عظیم کا مذہب زیادہ صحیح اور سنی برصطحت ہے۔ لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ لعان سے انکار کرنے کو جرم مستلزم سزا قرار دیا جائے، اس لئے سردست ضابطہ شرعی میں اس کے لئے مناسب شکل یہ ہوگی کہ اگر مرد لعان سے انکار کرے تو عورت کو اس پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے، اور اگر عورت انکار کرے تو مہر سے محروم کر دیا جائے۔

تطلیقات ثلاثہ در مجلس واحد ایک وقت میں طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علماء اہل سنت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ

ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق بائن کے حکم میں۔ لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اُس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اُس کے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو یک وقت تین طلاقیں دیں تو حضور غصہ میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا اَلْبَلْبُ بِلِقَابِ اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ وَانَا بَيْنَ الظُّهْرِ كَمَا كَتَبَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ فِي كِتَابِ سَكِينٍ كَمَا جَاءَ، حالانکہ ابھی میں تہمت سے درمیان موجود ہوں؛ "بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضور نے اس فعل کو معصیت فرمایا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص ان کے پاس مجلس واحد میں تین طلاق دینے والا آتا تو وہ اس کو دسے لگاتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے اس فعل پر سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

ہم سے زمانہ میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے۔ لوگ کسی فوری جذبہ کے تحت اپنی بیویوں کو تین طلاقیں دے دیتے ہیں، پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی جیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی جھوٹی قسمیں کھا کر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور کوئی طلاق کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بدستور سابق تعلقات باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے نقصان سے بچنے کے لئے متعدد دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان خرابیوں کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تطہیفات ثلاثہ در مجلس واحد پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مطلقہ عورت کو جسے یک وقت تین طلاقیں دی گئی ہوں، عدالت میں ہرمانہ کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے، اور ہر جانہ کی مقدار کم از کم ہر کی نصف مقدار تک مقرر کی جائے۔ اس کے علاوہ اور صورتیں بھی روک مقام کی نکل سکتی ہیں جن کو ہمارے علماء اور ماہرین قانون عجز و خوض کے بعد تجویز کر سکتے ہیں۔

خاتمہ کلام اس رسالہ میں اسلامی قانون ازدواج کے مقاصد و اصول کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور کتاب و سنت کی تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج کل مسلمان ہند کی ازدواجی زندگی میں مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کر رہے ہیں۔ ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ جو کچھ ہم نے اسلام کے قانون کو سمجھا ہے وہ بالکل صحیح ہے، نہ ہم کو اس پر اصرار ہے کہ حل مشکلات کے لئے جو تجویزیں ہم نے پیش کی ہیں ان کو بعینہ قبول کر لیا جائے۔ انسانی رائے میں بہر حال خطا و صواب دونوں کا امکان ہے، اور کسی انسانی رائے کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خطا سے پاک اور وحی خداوندی کی طرح واجب الاطاعت ہے۔ ہمارا مقصد اس طویل بحث و تحقیق سے صرف اس قدر تھا کہ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلامی قانون ازدواج کے جو اصول ہم نے سمجھے ہیں ان کو بیان کر دیں، اور پھر ان اصول سے اکابر صحابہ و ائمہ مجتہدین نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ان پر نظر ڈال کر ایسے فروع اخذ کر لیں جو ہمارے نزدیک اس زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے مفید اور مناسب ہیں۔ سب یہ اہل علم اور اصحاب فکر و رائے کا کام ہے کہ بحث و نظر اور تدبر فی الكتاب والسنہ سے کام لے کر ہماری ان تجاویز پر غور کریں۔ اگر اس میں کچھ خطا پائیں تو اس کی اصلاح کر دیں، اور اگر کوئی حیرت انگیز صواب نظر آئے تو اس کو مفضل اس بنا پر رد نہ کر دیں کہ نیکو بلا بد قسمتی سے چوتھی صدی کے بجائے چودھویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔

آخر میں ہم ان مسودات قانون کے متعلق بھی محلاً اپنی رائے ظاہر کر دینا چاہتے ہیں جو اس سلسلہ میں حیدرآباد اور برطانوی ہند کے بعض حضرات نے مرتب کئے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سب سوئے تشنہ اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے غیر مکتفی ہیں۔ اس قسم کے مختصر مسودات سے ان خواہجوں کو دور نہیں کیا جا سکتا جو ایک گلو محمدان لاکے نقائص اور غیر مسلم عدالتوں کے صد سالہ نظائر اور موجودہ عدالتی نظام کے طریق کار سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اگر چند خاص معاملات میں یہ طے کر دیا گیا کہ فقہ حنفی کے لئے یہاں ان مسودوں کے بعض نفس مضمون سے بحث ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ آیا مجالس قانون ساز کو بجائے خود کوئی

بجائے فقہ مالکی کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ یا بعض مسائل میں جزئیات کی مختصر تشریح بھی کر دی گئی، تو اس سے وہ حکام عدالت کو فی صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے جو تو این شریعت اور مذہب فقہیہ کے جزئیات پر کوئی وسیع نظر نہیں رکھتے، اور جن کے دماغوں پر وہی ایٹھلو محمدن لاکھی اسپرٹ منسٹ ہے اس بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خاص کر ازدواجی معاملات کے لئے ایک مفصل ضابطہ مرتب کیا جائے جیسا کہ ہم اس رسالہ کے گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ وقت اور محنت چاہتا ہے۔ اور ایک شخص کے بس کا بھی نہیں ہے۔ اس کے لئے اصحاب علم و رائے کی ایک منتخب جماعت کو ایک کافی مدت تک سر جوڑ کر بیٹھا چاہئے، اور یہ سمجھ کر کام کرنا چاہئے کہ وہ محض متقدمین کی کتابوں سے جزئیات کو لفظ بلفظ نقل کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، بلکہ امت کے ارباب حل و عقد ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ تو این شریعت کی ایسی تعبیر کریں جس سے شریعت کے اصلی مقاصد پورے ہوں اور قوم کے دین، اخلاق اور معاملات کی حفاظت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے۔ ✓

(بقیہ حاشیہ ص ۹۸) "اسلامی قانون" پاس کرنے کا حق ہے بھی یا نہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے جو قانون یہ پاس کریں،

خواہ وہ لفظ بلفظ شریعت کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، بہر حال وہ شرعی قانون نہیں ہو سکتا۔

یورپ کے قوانین طلاق و فسخ و تفریق

[تعرفت الاشیاء باضدادھا۔ اسلامی قانون ازدواج کی جو تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں ان کو دیکھ کر پوری طرح اس قانون کی شان کمال کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کے ان قوانین کا مطالعہ نہ کیا جائے جن کے متعلق ترقی یافتہ قوانین ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اس مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر انسان جب خود اپنا قانون ساز بنتا ہے تو کس قدر ٹھوکریں کھاتا ہے۔]

اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اصول اور اساسی احکام میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اخلاق کا ایک بلند ترین نصب العین پیش نظر رکھتا ہے تو دوسری طرف انسانی فطرت کی کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک طرف وہ تمدنی و اجتماعی مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے تو دوسری طرف افراد کے حقوق بھی پامال نہیں ہونے دیتا۔ ایک طرف وہ واقعی حالات پر نگاہ رکھتا ہے تو دوسری طرف ایسے امکانات کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا جن کا کسی وقت عالم واقعہ میں آنا متوقع ہے۔ غرض یہ ایک ایسا معتدل قانون ہے جس کا کوئی قاعدہ اور کوئی حکم افراط و تفریط کی جانب مائل نہیں ہے۔ قانون سازی میں جتنے مختلف پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ان سب کا اس میں نظری حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عملاً پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، اور ان کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا گیا ہے کہ کہیں کسی ایک طرف نامناسب میلان اور کسی دوسرے پہلو سے غیر منصفانہ اعراض نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تیرہ سو

برس سے یہ قانون مختلف ملکوں، مختلف زمانوں، مختلف اتمدنی حالات، اور مختلف علمی مراتب اور سماجی کیفیات رکھتے والی قوموں میں رائج رہا ہے اور کہیں کسی شخصی یا اجتماعی تجربے نے اس کے کسی اساسی حکم کو غلط یا قابل ترمیم نہیں پایا۔ یہی نہیں بلکہ انسانی فکر باوجود سعی بلیغ، اس کی کسی چیز کا ایسا بدل تجویز کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکی جو اعتدال اور توازن اور تناسب میں اس کے لگ بھگ بھی پہنچتا ہو۔

یہ کیفیت جو اسلامی قانون میں پائی جاتی ہے، صرف الہی حکمت و بعیرت ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ انسان اپنے لازمی تقیدات اور اپنی فطری محدودیتوں کے ساتھ کبھی اس پر قادر ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی سسٹم کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے، احال اور مستقبل پر یکساں نظر رکھے، ما بالفعل اور ما بالقوہ پر ایک ساتھ نگاہ ڈالے، خود اپنی اور اپنے تمام ابناء کی فطرت کے چھپے اور ظاہر خصائص کا پورا پورا لحاظ کرے، اپنے ماحول کے اثرات سے بالکل آزاد ہو جائے، اور اپنے جذبات اور طبعی رجحانات اور عقلی کوتاہیوں اور علمی نارسائیوں سے یکسر پاک ہو کر کوئی ایسا قاعدہ وضع کر سکے جو ہر حال اور ہر زمانے اور ہر ضرورت پر ٹھیک ٹھیک عمل اور مناسبت کے ساتھ منطبق ہو سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے قوانین انسانی فکر پر مبنی ہوتے ہیں ان میں صحیح توازن نہیں ہوتا۔ کہیں نظریات میں بے اعتدالی ہوتی ہے۔ کہیں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی رعایت میں کوتاہی کی جاتی ہے۔ کہیں اشخاص کے حقوق اور واجبات متعین کرنے میں عدل نہیں ہوتا۔ کہیں شخص اور جماعت کے درمیان حدود اور حقوق کی تقسیم میں بے انصافی ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ ہر نئے تجربے اور ہر تغیر حالت اور ہر بدلے ہوئے زمانے میں ایسے قوانین کی کمزوریاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں، اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ یا تو ان میں ترمیم کرے یا اعتقاداً ان کا متبع رہ کر عملاً ان کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔

الہی قانون اور انسانی قانون کے درمیان یہ بنیادی فرق آج اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ بجز انہوں

اور شہرہ چٹھوں کے شخص اس کو دیکھ سکتا ہے۔ کل تک تعصب یا جہل کی وجہ سے اسلامی قانون کے جن احکام اور اصولوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کئے جاتے تھے، اور ان کے مقابلے میں انسانی قوانین کے جن نظریات اور قواعد پر فخر کا اظہار کیا جاتا تھا آج ان کے متعلق کسی بحث و استدلال کے بغیر محض واقعات ہی کی تعادل انکار شہادت سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے کہ جو کچھ اسلام نے سکھایا تھا وہی صحیح تھا اس کے خلاف جتنے طریقے انسانی قوانین نے تجویز کئے تھے وہ سب غلط اور ناقابل اتباع نکلے، اگرچہ عالم تخیل میں وہ بہت ہی درخشاں نظر آتے تھے۔ زبانیں اب بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے انکار کرتی ہیں، مگر عملاً دنیا ان قوانین کو توڑ رہی ہے جن کو کل تک وہ نہایت مقدس اور ناقابل ترمیم سمجھی تھی اور آہستہ آہستہ ان اصول و قواعد کی طرف رجوع کر رہی ہے جو اسلام نے مقرر کئے تھے، ایک بعد از خواری بیار۔

مثال کے طور پر طلاق کے مسئلہ کو لے لیجئے جس پر ابھی چند سال پہلے تک سبھی دنیا مسلمانوں کو کیسے کیسے طعنے دیتی تھی، اور بہت سے مرعوب مسلمانوں کو شرمندگی کے مارے جو اب بن نہ آتا تھا مگر دیکھتے دیکھتے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ازودواج کے مقدس رشتے کو ناقابل انقطاع قرار دینا اور قانون میں طلاق و خلع اور خلع و تفریق کی گنجائش نہ رکھنا مسیحیت کا کوئی حکیمانہ فعل نہ تھا، بلکہ محض انسانی فکر کی بے اعتدالی کا نتیجہ تھا، اور اس میں اخلاق و انسانیت اور نظام تمدن کی فلاح نہیں بلکہ تباہی کے اسباب مضمر تھے۔

مسیح کے یہ الفاظ کس قدر شاندار ہیں کہ:-

”جسے خدا نے جوڑا اُسے اُدھی جدا نہ کرے“ (متی ۱۹: ۶)

مگر مسیحیوں نے نبی کے اس قول کا منشا نہ سمجھا اور اسے اخلاقی ہدایت کے بجائے قانون ازودواج کی اساس بنا لیا۔ انجام کیا ہوا؟ مسیحی دنیا صدیوں تک اس ناقابل عمل قانون کے خلاف حیلوں اور کد و فریب کے ساتھ عمل کرتی رہی پھر خلافتِ دہریہ قانون کی عادت بدلنے اتنی ترقی کی کہ جو اخلاقی

عیدیں رشتہ ازدواج سے زیادہ مقدس تھیں ان کو بھی بکثرت اور علانیہ توڑا جانے لگا۔ آخر کار انسانوں نے مجبور ہو کر اُس قانون میں چند جزوی اور ناقص ترمیمیں کیں جس کو وہ غلطی سے خدا کا قانون سمجھ رہے تھے۔ مگر یہ صدمہ قدم اُس وقت اٹھایا گیا جب قانون شکنی کی عادت نے پیروانِ حق کے دلوں میں خدا کی جوڑی ہوئی چیز کا احترام باقی ہی نہ چھوڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان جزوی اور نہایت ناقص ترمیموں ہی کی بدولت سبکی دنیا میں طلاق اور فسخ و تفریق کا ایک طوفان امنڈ آیا جس کی شدت سے نظامِ عائلی کی "مقدس" دیواریں پاش پاش ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ انگلستان جہاں ۱۸۷۵ء میں صرف ۱۶۶ تفریقیں ہوئی تھیں، وہاں ۱۹۲۳ء میں چار ہزار سے اد پر تفریقیں ہوئیں، یعنی خدا کے جوڑے ہوئے ہر ۷۹ رشتوں میں سے ایک کو آدمی نے جدا کر دیا۔ امریکہ جہاں ۱۸۸۶ء میں ۳۵ ہزار تفریقیں ہوئی تھیں وہاں ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ ۸۳ ہزار مقدس رشتے قطع کئے گئے۔ فرانس میں تو اب قریب قریب ہر ۱۵ شادیوں کا انجام طلاق پر ہو رہا ہے۔ اور کم و بیش یہی حال دوسرے مغربی ممالک کا بھی ہے۔

سبح نے جو تعلیم دی تھی اسی سے طبی تعلیم قرآن میں بھی ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ اَلَّذِينَ يَتَّقُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَهُ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوْصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (البقرہ: ۳)۔ مسیح نے یہودیوں کی سخت دلی اور طلاق کی نثرت کے خلاف نفرت دلانے کے لئے کہا تھا کہ "جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑے اور دوسرا بیاہ کرے وہ ناکرتا ہے" (متی: ۱۹: ۵)۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس غرض کے لئے اس سے زیادہ سچے تھے الفاظ میں طلاق کو البعض المباحات (جائز کاموں میں سے سب سے زیادہ برا کام) فرمایا اور نفس پرستی کی خاطر طلاق دینے والے کو ملعون ٹھہرایا۔ مگر یہ اخلاق کے بلند پایہ اصول محض اشخاص

سے جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور ان تعلقات کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا

ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، یقیناً وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

کی تعلیم کے لئے تھے تاکہ وہ اپنے عمل میں ان کو پیش نظر رکھیں، نہ یہ کہ انہیں کو بجنسہ لے کر ایک قانون کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف معلم اخلاق ہی نہ تھے بلکہ صاحب شریعت بھی تھے، اس لئے آپ نے اصول اخلاق بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ قانون میں ان اخلاقی اصولوں کی آمیزش کا صحیح تناسب کیا ہونا چاہیے اور اصول اخلاق و مقتضیات فطرت انسانی کے درمیان کس طرح توازن قائم رہ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے مسیح علیہ السلام صاحب شریعت نہ تھے بلکہ اجرائے شریعت کی نوبت آنے سے پہلے ہی دنیا میں ان کی نبوت کا مشن ختم ہو گیا تھا اس لئے ان کے ارشادات میں اخلاق کے ابتدائی اصولوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ زندگی کے عملی مسائل پر ان اصولوں کا صحیح انطباق اگر ہو سکتا تھا تو موسوی شریعت کی روشنی ہی میں ہو سکتا تھا۔ مگر مسیحی یہ سمجھے اور سینٹ پال نے ان کو یہ سمجھا یا کہ ان اصولوں کو پالینے کے بعد اب ہم الہی شریعت سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور یہ خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ چرچ کا کام ہے کہ ان اصولوں کی بنا پر خود قوانین بنائے۔

یہ عظیم الشان غلط فہمی تھی جس نے چرچ اور اس کے متبعین کو ہمیشہ کے لئے گمراہی میں ڈال دیا۔ سچت کی دو ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے جتنے اصول دین بتائے تھے ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر بھی کوئی صحیح قانون بنانے میں چرچ کو کامیابی نصیب نہ ہوئی اور آخر کار مسیحی تو میں ان اصولوں ہی سے انحراف کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

مسیح نے طلاق کی جو برائی کی تھی اس میں "حرام کاری" کا استنثار کر کے گویا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ طلاق مطلقاً بری چیز نہیں بلکہ سبب ہار کے بغیر مبغوض ہے۔ مسیحی اس کو نہ سمجھا اور سادہ پر دالی آیت "جیسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے" سے متعارض کچھ کر بعض نے تو یہ رائے قائم کر لی کہ ایسے استنثار بعد کا اضافہ ہے اور بعض نے اس سے یہ مسئلہ نکال لیا کہ "حرام کاری" کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرادی جائے، مگر رشتہ نکاح بدستور قائم ہے، اور دونوں میں سے کسی کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت

نہ ہو۔ صدیوں تک مسیحی دنیا اسی پر عمل کرتی رہی اور منجملہ دوسرے قوانین کے یہ قانون بھی مسیحی قوموں کے اندر بد اخلاقی کے ردواج کا بہت کچھ ذمہ دار ہے۔

لطف یہ ہے کہ چرچ کے اثر سے آزاد ہو جانے اور بالکل عقلی اصولوں پر قانون سازی کا ادا کرنے کے باوجود انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں اب تک قانونی تفریق (Judicial separation) کے معنی ہی سمجھے جاتے ہیں کہ زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے مگر دلائل نکاح نکاح نامی کے مجاز نہ ہوں۔ یہ ہے انسانی عقل کی کوتاہیوں کا حال۔

کلیسائے روم کے مذہبی قانون (Canon Law) میں مذکورہ بالا اصول کی بنا پر جو قواعد بنائے گئے تھے ان کی رو سے طلاق (Divorce) یعنی رشتہ نکاح کا کامل انقطاع جس کے بعد زوجین کو الگ الگ نکاح کرنے کا حق حاصل ہوا قطعاً ممنوع تھا۔ البتہ تفریق کے لئے ۶ صورتیں تجویز کی گئی تھیں:-

(۱) زنا یا جرائم خلاف وضع فطری۔

(۲) نامردی۔

(۳) ظالمانہ برتاؤ۔

(۴) کفر۔

(۵) ارتداد

(۶) زوجین کے درمیان حرام خونی رشتوں میں سے کوئی رشتہ نکل آنا۔

ان چھ صورتوں میں جو قانونی چارہ کار تجویز کیا گیا وہ یہ تھا کہ زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ہمیشہ سب سے زندگی بسر کریں۔ کون صاحب عقل اس چارہ کار کو مطالب عقل کہہ سکتا ہے؟ دراصل یہ کوئی قانونی چارہ کار نہ تھا بلکہ ایک سزا تھی جس کے خوف سے لوگ تفریق کے مقدمے ہی عدالتوں میں لے جاتے ہوئے ڈرتے تھے، اور اگر کسی تضا کے بارے میں جوڑے کی تفریق ہو جاتی تھی تو اسے لامحالہ یا تو یہ سزا

کی سی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی، یا پھر مدت العمر حرام کاری میں مبتلا ہوتا پڑتا تھا۔

اس شدید اور ناقابل عمل قانون سے بچنے کے لئے مسیحی علمائے بہت سے شرعی حیلے نکال رکھے تھے جن سے کام لے کر چرچ کا قانون ایسے بد نصیب زوجین کا نکاح منسوخ کر دیتا تھا۔ من جملہ ان کے ایک حیلہ یہ تھا کہ اگر کسی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ زوجین نے مدۃ العمر ساتھ رہنے کا جو عہد کیا تھا وہ بلا ارادہ ان سے سرزد ہو گیا تھا ورنہ دراصل ان کا مقصود محض ایک محدود مدت کے لئے رشتہ ازدواج میں منسک ہونا (متعد) تھا، تو اس صورت میں مذہبی عدالت نسخ نکاح یا بالفاظ صحیح تر بطلان نکاح (Nullity) کا اعلان کر دے گی۔ مگر مسیحی قانون کی رو سے "بطلان" نکاح کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ زوجین میں کوئی نکاح ہی نہیں ہوا، اب تک ان کے درمیان ناجائز تعلقات تھے اور ان سے جو اولاد ہوئی وہ حرامی تھی! اس معنی کے لحاظ سے یہ دوسرا قانونی چارہ کار پہلے سے بھی ذلیل تر تھا۔

رومن چرچ کے بالمقابل مشرقی کلیسا (Orthodox Eastern Church) نے جس کو فقہ اسلامی سے متاثر ہونے کے بہت زیادہ مواقع ملے ہیں نسبتاً ایک بہتر اور قابل عمل قانون بنایا ہے۔ اس کے نزدیک بند نکاح سے زوجین کو حسب ذیل وجوہ کی بنا پر آزاد کیا جاسکتا ہے:

(۱) زنا، یا اس کے مقدمات (۲) ارتداد (۳) شوہر کا اپنی زندگی کو قیاس کی حیثیت سے مذہبی خدمت کے لیے وقف کرنا۔ (۴) بغاوت (۵) نشوز (۶) نامردی (۷) جنون (۸) برص و جذام (۹) طویل مدت کے لئے قید ہونا۔ (۱۰) نفرت باہمی یا شدید ناموافق مزاج۔

لیکن مغربی ممالک کے مذہبی پیشوا اس قانون کو نہیں مانتے۔ وہ کلیسائے روم کی فقہ پر ایمان لا چکے ہیں جس میں قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ رشتہ نکاح بجز موت کے کسی اور چیز سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ اب اس فتوے کے بعد ان کے لئے عقل سے کام لینا تو درکنار خود اپنے ہی دین کے ایک دوسرے مذہب فقہی پر چڑ کر نامھی حرام ہے۔ ۱۹۱۲ء کے رائل کمیشن کے سامنے بشپ گور (Bishop Gore) نے

مشرقی کلیسا کے بعض مسائل اخذ کرنے کی مخالفت محض اس سبب کی بنا پر کی کہ انگریزی چرچ رومن کلیسا کی فقہ کا پابند ہے ۱۹۱۳ء کی (Lambeth Conference) میں بالفاظ صریح یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم کسی ایسے مرد یا عورت کا نکاح ہی نہیں پڑھا سکتے جس کا سابق شریک حیات ابھی زندہ موجود ہو۔ آخری اصلاح جس پر ۱۹۳۵ء میں انگلستان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک مجلس (Joint Committee of Convocation) متفق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر نکاح سے پہلے کوئی فریق امراتن جیشہ میں مبتلا ہو، یا مردی خرابی دماغ یا نقص جسمانی کا شکار ہو، اور نکاح کے وقت اس کو دوسرے فریق سے چھپایا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور نکاح کے وقت اس نے شوہر سے اپنے حمل کو مخفی رکھا ہو تو نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کے بعد ایسی کوئی عورت پیش آئے تو نہ عورت کے لئے مذہبی حیثیت سے کوئی چارہ کار ہے اور نہ مرد کے لئے!

یہ تو تھانہ ہی گروہ کا حال جس میں صدیوں تک پے در پے بڑے بڑے عقلاء، علماء اور فقہار پیدا ہوئے، مگر ابتدا میں ان کے پیشواؤں سے مسیح علیہ السلام کے ایک ارشاد کا مفہوم اور اس کی قانونی حیثیت سمجھے نہیں جوتھی ہوئی تھی، اس کا اثر ان کے دل و دماغ پر ایسا گہرا جم گیا کہ امتداد زمانہ، تغیر احوال، علمی و عقلی ارتقاء، انسانی فطرت کا مطالعہ، سائنسوں برس کے تجربات، خود صریح عقل کے فیصلے اور دوسرے بہتر قوانین کے نظائر، غرض یہ سب چیزیں بل جل کر بھی ان کو اس اثر سے آزاد نہ کر سکیں، اور دو ہزار برس کی طویل مدت میں بھی رومن چرچ کے بہتر میں دماغ اپنے قانون کا توازن درست کرنے اور اس کو اعتدال کے صحیح نقشے پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اب ذرا ایک نظران روشن خیال اور وسیع علم و تجربہ رکھنے والے واضعین قانون کے کارناموں پر بھی ڈال لیجئے جنہوں نے مذہبی قانون کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی قوموں کے لئے خود اپنے علم کے بل بوتے پر ازدواجی قوانین بنائے ہیں۔

انقلابِ فرانس سے پہلے تک یورپ کے اکثر پیشتر ممالک میں رومن چرچ کا مذہبی قانون نافذ تھا، اور اس نے دوسرے ایسے ہی قوانین کے ساتھ مل کر مغربی قوموں کی معاشرت اور ان کے اخلاق کو بہت سی شدید خرابیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انقلابی دور میں جب آزاد تنقید اور آزادانہ تفکر کی ہوا چلی تو سب سے پہلے اہل فرانس نے اس قانون کے نقائص کو محسوس کیا اور یہ دیکھ کر علمائے دین کسی طرح اس کی اصلاح پر آمادہ نہیں کئے جاسکتے، سرے سے اس کا جوابی اپنے کندھوں سے اتار پھینکا (۱۷۹۲ء)۔ اس کے بعد یہی ہوا دوسرے ممالک میں بھی چلی اور رفتہ رفتہ انگلستان، جرمنی، آسٹریا، ہجیم، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، سویٹزرلینڈ وغیرہ نے مذہبی قانون کو چھوڑ کر اپنے اپنے جداگانہ قوانین نکاح و طلاق وضع کر لئے جن میں قانونی تفریق اور فرسخ کے علاوہ طلاق کے لئے بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس طرح صحیح اقوام کے ایک جم غفیر کا اپنے مذہبی قانون سے آزاد ہو جانا براہ راست نتیجہ ہے اس تنگ نظری، جہل اور تعصب کا جس کی بنا پر سچی علما ایک ناقابل عمل، خلافِ فطرت اور سخت مضرت رسالہ قانون کو جبراً محض مذہب کی طاقت سے مستطرد کھنے پر اصرار کر رہے تھے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا نہ تھا۔ محض چند مسائل کے اجنباد پر مبنی تھا لیکن پادریوں نے اس کو خدائی قانون کی طرح مقدس اور ناقابلِ ترمیم قرار دیا۔ انہوں نے اس کی کھلی ہوئی غلطیوں، مضرتوں، اور خلافِ عقل امور کو دیکھنے اور سمجھنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ محض اس لئے کہ کہیں سینٹ پل اور فلاں اور فلاں، ائمہ متقدمین کے نکلے ہوئے مسائل میں غلطی کا ارتکاب ہی فرض کر لینے سے ان کا ایمان سلب نہ ہو جائے جتنی کہ انہوں نے خود اپنے دین کے ایک دوسرے فقہی مذاہب سے بھی استغناء کرنے کی مخالفت کی، انہ اس بنا پر کہ مغربی چرچ کا قانون مشرقی چرچ کے قانون سے بہتر ہے بلکہ صرف اس بنا پر کہ ہم مغربی چرچ کے مقلد ہیں۔ مذہبی پیشوائوں کے اس طرز عمل نے مغربی قوموں کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار باقی ہی نہ رکھا کہ وہ ایسے قانون کی بندشوں کو توڑ پھینکیں جس کی غلطیاں اور مضرتیں ظاہر ہو جانے کے باوجود قابل اصلاح نہیں سمجھی جاتیں۔

ایک قانون ازواج ہی پر کیا موقوف ہے۔ دراصل یہی پادریانہ ذمہ داری کی قوموں کو الحاد و ہتھیاری اور لادینی کی طرف دھکیل دھکیل کر لے گئی ہے۔

مذہبی قانون سے آزاد ہونے کے بعد مغربی ممالک میں گزشتہ سترہ سالوں کے اندر جواز و واجی قوانین وضع کئے گئے ہیں ان کو بنانے میں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں ماغولوں نے اپنی بہترین قابلیتوں کے ساتھ حصہ لیا ہے، اور نئے تجربات کی روشنی میں پے در پے ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کرتے رہے ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے قوانین میں وہ توازن اور اعتدال پیدا نہیں ہو سکا ہے جو عرب کے ایک اسی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پیش کئے ہوئے قانون میں پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مذہبی قانون سے آزاد ہونے پر بھی وہ اپنے دل و دماغ کو ان تصورات سے اب تک پاک نہیں کر سکے ہیں جو انہیں دین و من چھچکا بتدانیٰ انہوں سے وراثت میں ملے ہیں۔

مثال کے طور پر انگلستان کے قانون کو لیجئے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے تک وہاں عورت زنا اور ظالمانہ برتاؤ، رعایا سے وجہ تھے جن کی بنا پر قانونی تفریق کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ طلاق جس کے بعد زوجین نکاح نامی کے لئے آزاد ہوں اس وقت تک وہاں ممنوع تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قانون میں مذکورہ بالا دو وجوہ کے ساتھ رٹاریا انقطاع تعلق زن و شو (Desertion) کو بھی ایک جائز وجہ تفریق قرار دیا گیا بشرطیکہ وہ دو سال یا اس سے زیادہ مدت تک جاری رہا ہو علاوہ بریں اسی قانون میں طلاق یعنی عقدہ نکاح سے قطعی آزادی کو بھی جائز کیا گیا، مگر اس کے لئے لازم کر دیا گیا کہ مرد عدالت سے رجوع کرے۔ بطور خودہ طلاق نہیں دے سکتا۔ اور اسی طرح عورت کے لئے بھی لازم کیا گیا کہ اگر وہ طلاق لینا چاہے تو گھر کے گھر ہی میں مرد سے معاملہ طے نہیں کر سکتی، بلکہ ہرحال میں اسے بھی عدالت سے ہی رجوع کرنا ہوگا۔ پھر عدالت کے لئے طلاق کی ڈگری دینے کی ضرورت ہی صورت رکھی گئی، اور وہ یہ کہ اگر مرد طلاق چاہتا ہو تو وہ بیوی کا مرکز بنا ہونا چاہتا ہے۔ اور اگر عورت طلاق چاہتی ہو تو وہ شوہر کے ساتھ نکاح اور اس کے ساتھ ہی ظالمانہ برتاؤ

یا نشوز کا بھی ثبوت ہے۔ اس طرح گویا عورتوں اور مردوں کو مجبور کیا گیا کہ خواہ وہ کسی وجہ سے ایک دوسرے کو چھوڑنا چاہتے ہوں، بہر حال ان کو ایک دوسرے پر زنا کا الزام ضرور لگانا پڑے گا، اور ایک کھلی عدالت میں اس کا ثبوت دے کر ہمیشہ سے لئے سوسائٹی کے ایک فرد کی زندگی کو داغدار بنا دینا ہو گا۔ اس قانون نے ذہن کے جھوٹے الزامات تراشے کا دروازہ کھولا، عدالتوں کو سوسائٹی کے تمام گندے لپٹے دھونے کی جگہ بنا دیا، اور پھر عدالتہائے طلاق کے مقدمات کی اشاعت گویا بد اخلاقی کی اشاعت کا ذریعہ بن گئی۔ مزید برآں اس قانون نے شوہروں کو ذیوثی کی بھی تعظیم دی، کیونکہ اس میں شوہر کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی بیوی کے ناجائز دوست سے ہر جانہ بھی وصول کر سکتا ہے یعنی عورت کی عصمت کا معاوضہ! تمتع ناجائز کی قیمت جو قمر ساتوں کا ذریعہ آمدنی ہوا کرتی ہے!!

۱۸۶۶ء کے قانون میں عدالت کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو نکاح کو توڑنے کے ساتھ ساتھ خطا کار شوہر پر مطلقہ عورت کے نفقہ کا بار بھی ڈال سکتی ہے۔ ۱۹۰۷ء کے قانون میں شوہر کے خطا کار ہونے کی شرط اڑادی گئی، اور عدالت کو مطلقاً یہ حق دیا گیا کہ جہاں مناسب سمجھے مطلقہ عورت کے نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ڈال دے۔ بیچورتوں کے ساتھ کھلی ہوئی جانبداری ہے اور یہاں صاف طور پر توازن بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ جب عورت اور مرد کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تو محض سابق تعلق کی بنا پر ایک غیر عورت کو ایک غیر مرد سے نفقہ دلوانا درناخالیکہ اس نفقہ کے بالمقابل اس مرد کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، نہ عقلاً درست ہے اور نہ اس کو مبینی برانصاف کہا جاسکتا ہے۔

۱۸۹۵ء کے قانون میں طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم و ستم کی وجہ سے اس کا گھر چھوڑ کر نکل جائے اور اس سے الگ رہے تو عدالت شوہر کو اس کے پاس جانے سے

(۳) شہزادی ہپی کی بنا پر تین سال کے لئے زوجین میں تفریق کرائی جائے۔ اور اگر اس مدت میں بدلت نہ چھوٹے تو ضرور سیدہ فریق کو طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق ہو۔

(۴) نکاح سے قبل اگر کسی فریق کو جنون یا امراض جنیثہ میں سے کوئی مرض ہو اور دوسرے فریق سے چھپا پالیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور اس نے اپنا حمل مخفی رکھا ہو تو اس کو نسخ نکاح کے لئے کافی وجہ قرار دیا جائے۔

(۵) مقدمات طلاق کی رپورٹیں دوران مقدمہ میں نہ شائع کی جائیں اور بعد میں عدالت ردداء کے جن حصوں کو شائع کرنے کی اجازت دے صرف انہی کو شائع کیا جائے۔

ان تجاویز میں سے صرف پہلی تجویز کو جو سب سے زیادہ نامعقول تھی قبول کر کے ۱۹۲۳ء کے قانون معاملاً از دواج (Matrimonial Causes Act) میں شائع کیا گیا، باقی جتنی تجویزیں تھیں ان میں سے کسی کو بھی اب تک قانون کی صورت نہیں دی گئی، کیونکہ کنٹریری کے اسقف اعظم (Archbishop of Canterbury) اور بعض دوسرے بااثر لوگ ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔

انگلستان کے بہترین قانونی دماغوں کے تفقہ کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ وہ عورت اور مرد کے ارتکاب زنا کا قانونی اور فطری فرق تک سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی اس غلط قانون سازی کی بدولت عورتوں کی طرف سے اپنے شوہروں کے خلاف طلاق کے دعووں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ انگلستان کی عدالتیں ان سے پریشان ہو گئیں اور ۱۹۲۸ء میں لارڈ مری ویل (Lord Merrivale) کو ان کی ردک تمام کی طرف توجہ کرنی پڑی۔

یورپ کے جن ممالک میں رومن پریچ کا اثر زیادہ ہے وہاں اب تک رشتہ نکاح ناقابل انقطاع ہے البتہ بعض صورتوں میں قانونی تفریق ہو سکتی ہے جس کے بعد نہ زوجین مل سکتے ہیں نہ آزاد ہو کر

نکاح ثانی کر سکتے ہیں۔ آرٹریٹڈ اور اٹلی کے قوانین اسی قاعدہ پر مبنی ہیں۔

فرانس میں قانون ازدواج نے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ انقلاب کے بعد طلاق کو نہایت آسان کر دیا گیا۔ نپولین کے قانون (Code Napoleon) میں اس پر چند ہائیندیاں عائد کی گئیں۔ ۱۸۱۶ء میں اس کو قطعاً ممنوع کر دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں پھر سے جائز کیا گیا، اور اس کے بعد ۱۸۸۶ء اور ۱۹۰۶ء اور ۱۹۲۴ء میں اس کے لئے مختلف قوانین بنائے گئے سچی کی رو سے طلاق سے لئے حرف ذیل وجوہ قرار دیئے گئے ہیں:۔ زوجین میں سے کسی کا ارتکاب زنا، ظالمانہ برتاؤ، اصرار زوجین کا کوئی ناپسندیدہ فعل جس سے اس کے سامنے کی عزت پر حرف آئے، حقوق زوجیت ادا کرنے سے انکار، شراب نوشی کی لت، عدالت سے کوئی ایسی سزا پانا جو موجب ذلت ہو۔ علاوہ بریں عدالت سے طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عورت کے لئے تین سون کی مدت بھی مقرر کی گئی ہے جو اسلامی قانون کی ناقص تقلید ہے۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں قوانین طلاق ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں مگر ناقص اور غیر معتدل ہونے میں سب متفق ہیں:۔

آسٹریا، بلجیم، سویٹزر لینڈ اور ناروے میں زوجین صرف باہمی رضامندی سے طلاق کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ خلع سے ملتی جلتی چیز ہے مگر اس کی ناقص نقل ہے۔

جرمنی میں زوجین میں سے کسی ایک کا دوسرے کو چھوڑ دینا اور اس سے رتعلق ہو کر رہنا موجب طلاق نہیں ہوا۔ قریباً فیصل مسلسل ایک سال تک جاری نہ رہے۔ یہ قانون ابلا رکا ایک دھندلا سا عکس ہے۔ سویٹزر لینڈ میں اس کے لئے تین سال کی مدت ہے، اور ہالینڈ میں پانچ سال کی۔ دوسرے ممالک کے قوانین اس باب میں ساکت ہیں۔

منفرداً الجبر کے لئے سویڈن میں ۶ سال کی مدت انتظار ہے اور ہالینڈ میں دس سال۔ دوسرے

ممالک کے قوانین منفقہ و الخیر کے باب میں خاموش ہیں۔

مجزون کے لئے جرمنی، سوئیڈن اور سویٹزر لینڈ میں تین سال کی مہلت ہے، باقی کسی ملک کا قانون مجزون کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

بلجیم میں مطلقہ کے لئے دس مہینے کی عدت ہے، فرانس اور بلجیم کے سوا کہیں عورت کے نکاح ثانی کے لئے مدت انتظار مقرر نہیں کی گئی۔

آسٹریا میں اعداد ازدوجین کا پانچ سال یا اس سے زیادہ کی سزائے قید پانا و عوائے طلاق کے لئے کافی ہے۔ بلجیم میں مجرد سزا یا بھونا عورت یا مرد کو اپنے رفیق کے خلاف طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق دار بنا دیتا ہے۔ سوئیڈن اور ہالینڈ میں اس کے لیے صیص دوام کی شرط ہے۔

یہ ان قوموں کے قوانین ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔ مگر ان پر ایک نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ایک مکمل اور معتدل قانون بنانے میں کلیمیا نہیں ہوئی۔ ان کے مقابلے میں اسلامی قانون کو جو شخص انصاف کی نظر سے دیکھے گا اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عدل، توازن، فطرت انسانی کی رعایت، فتنوں کے سید باب، اخلاق کی حفاظت، تمدنی مصالح کی نگہداشت، اور از دوامی زندگی کے تمام مسائل و معاملات پر جامعیت کے ساتھ حاوی ہوتے ہیں اسلامی قانون جس کمال کو پہنچا ہوا ہے اس کا عشر عشر بھی مغربی قوانین کو نہ صرف فرداً فرداً بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی نصیب نہیں ہوا، حالانکہ یہ قوانین انیسویں صدی کے "روشن" زمانے میں یورپ کے سینکڑوں ہزاروں علماء و عقلا نے قریب قریب ایک صدی کے عور و خوخن اچھان بین اور قانونی تجربات کے بعد وضع کئے ہیں، اور اس قانون کو اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب کا ایک اقی بادیہ نشین پیش کر گیا ہے جس نے اس قانون سازی میں کسی پارلیمنٹ، کسی کمیشن، کسی جماعت ماہرین سے مشورہ نہیں لیا۔

اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی کہتا ہے کہ اسلامی قانون خدا کا نہیں انسان کا بنایا ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ ایسے انسان کو تو خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا۔ مگر اس کی صداقت کا اس سے زیادہ بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ایسے فوق البشری کارنامے کا کریڈٹ نہیں لیا اور صاف کہا کہ میں اپنے دل و دماغ سے کچھ بھی نہیں پیش کر سکتا، جو کچھ مجھے خدا سکھاتا ہے وہی تم تک پہنچا دیتا ہوں۔

پھر اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کے باوجود اگر انسان اپنی زندگی کے معاملات میں ہدایت الہی کی ضرورت سے انکار کئے چلا جائے، اور آپ اپنا بادی و شارع بننے ہی پر اصرار کرتا ہے تو بجز اس کے کہ اس کی اس ضد کو حماقت کہا جائے، اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس شخص سے براہ کراحتی کون ہوگا جس کو ایک بے غرض اور خیر خواہ رہ نما سیدھا راستہ بتانے کے لئے موجود ہو، مگر وہ کہے کہ میں تو خود ہی راستہ تلاش کروں گا، اور اس تلاش میں خواہ مخواہ مختلف راستوں پر بھٹکتا پھرے۔